نومبر 2018 ، قیمت :- /10₹

ماہنامہ

بچوں کی دنیا

Monthly BACHON KI DUNIYA, New Delhi

www.urducouncil.nic.in

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ اردو دنیا دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

تمام تر رنگین صفحات اور دیدہ زیب تصاویر سے مزین ماہانہ عالمی جریدہ جسے آپ پوری دنیا میں اردو زبان کے کسی بھی ماہنامے سے بہتر پائیں گے۔ اردو کو آج کی دنیا سے جوڑنے والا اور عام اردو قاری و ادبی حلقوں کی دلچسپی کے ساتھ طلبا و اساتذہ کی ضرورتوں کا بھی خیال رکھنے والا اردو کا ماہنامہ

ہر شمارے میں پڑھیے، اردو کے ادبی شاہکاروں کے علاوہ، علمی مضامین، ادبی انٹرویو، تاریخ، سائنس، صحافت، نئی کتابوں پر تبصرے، قومی اردو کونسل کی سرگرمیوں، سمیناروں اور فروغ اردو سے متعلق نئی کاوشوں کا احوال اور بہت کچھ!

فی شمارہ: 15 روپے، سالانہ: 150 روپے

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

سہ ماہی فکر و تحقیق

قومی اردو کونسل کی منفرد پیش کش

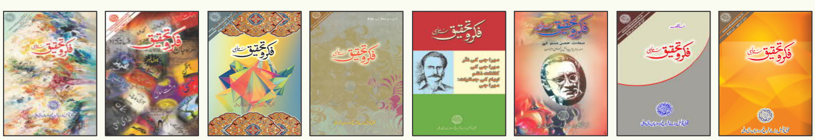

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظر عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

آج ہی اپنے نزدیکی بک اسٹال سے طلب کیجیے یا ہمیں لکھیے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی 110066، فون: 26109746، فیکس: 26108159

E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

اس شمارے میں

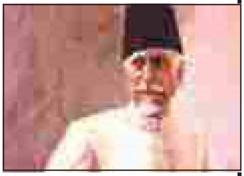

مدیر کا خط	آپس کی باتیں		04
بڑوں کی باتیں	ڈاک خانہ		05
نومبر کے مناسبت سے			
	مولانا ابوالکلام آزاد	انصار احمد درویش	07
	چاچا نہرو	عبدالرزاق دل	10
	ماہ نومبر کی تاریخی و ادبی اہمیت	محمد گلزار عالم	11
	تہوار روشنی کا	اسرار اللہ انصاری	14
	چاچا نہرو گھوڑے سے گرے	خواجہ احمد عباس	15
	گوپال کی دیوالی	رونق جمال	17
	اقبال کا زمانہ	سردار ساحل	19
مضامین	مکڑی بی ایک محنتی ہنر مند کیڑا	محمد خلیل	20
	رنگ نرالے سرکس کے	بانو سرتاج	23
نظمیں	مکڑی کا جالا	مہدی پرتاپ گڑھی	29
	کتابیں	فراق جلال پوری	29
	سیلاب	محمد رفیع انصاری	30
کہانیاں	روٹی کیوں پھولتی ہے؟	ذکیہ مشہدی	31
	گدڑی کا لال	محمد داؤد	33
	بچوں کے لیے دادا جان کی کہانی	تنویر پھول	35
نظم	سورج	مجیب شہزر	37
کہانیاں	بچے کی سخاوت	سراج فاروقی	38
	اللہ کی مدد	تسنیم فاطمہ	40
باتصویر کہانی	زمین	قاسم خورشید	42
قسط وار ناول	شہر میں جنگل	کمارن ست سیوم	46
کہکشاں	فاطمہ الفہری	طہٰ نسیم	51
	بدلہ	محمد علیم اسماعیل	52
	سائنسی معلومات	عائشہ میر اشفاق علی	53
	حضرت محل	جاں نثار معین	54
ننھے فنکار	سچی خوشی	عفیفہ سحر	59
	بچوں کی پینٹنگ		60
آپ کی باتیں	اردو فیس بک		62

بچوں کی دنیا

جلد: 6 شمارہ: 11 نومبر 2018

مدیر: ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

نائب مدیر: ڈاکٹر عبدالحی

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

وزارتِ ترقی انسانی وسائل، محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،

جسولہ، نئی دہلی-110025

فون: 49539000

شعبہ ادارت: 49539009-11

ای میل

bachonkiduniya@ncpul.in

editor@ncpul.in

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in

قیمت: /10 روپے، سالانہ /100 روپے

▪ اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

Total Pages: 64

'بچوں کی دنیا' کی خریداری کے لیے چیک، ڈرافٹ یا منی آرڈر بنام NCPUL، شعبہ فروخت کے پتہ پر بھیجیں اور وضاحت طلب امور کے لیے وہیں رابطہ فرمائیں۔

شعبہ فروخت

ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم

نئی دہلی-110066

فون: 26109746

ای میل: sales@ncpul.in

ncpulsaleunit@gmail.com

علاقائی مرکز: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002

فون: 040-24415194

آپس کی باتیں

پیارے دوستو! ماہ نومبر کی 14 تاریخ کو ہمارے ملک کے پہلے وزیراعظم پنڈت جواہر لعل نہرو پیدا ہوئے تھے۔ ان کے یوم پیدائش کو پورے ملک میں بچوں کے دن کے طور پر منایا جاتا ہے۔ اس دن تعلیمی اداروں میں خصوصی پروگراموں اور تقریبات کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ حکومت کے ذریعے بچوں کے لیے چلائی جارہی مختلف اسکیموں پر بھی گفتگو ہوتی ہے۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ ہماری سرکار آپ سب کے لیے کون کون سے پروگرام چلاتی ہے اوران پروگراموں سے آپ کیسے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ آیئے کچھ اہم سرکاری اسکیموں کی بات کرتے ہیں۔

ہماری سرکار نے پسماندہ ذات اور اقلیتی حلقہ کے میٹرک پاس ہونے والے بچوں کے لیے مالی تعاون کی اسکیم چلا رکھی ہے جس کے تحت انھیں وظیفہ دیا جاتا ہے۔ اس اسکالرشپ کے لیے امتحان میں کم سے کم 50 فیصد نمبرات ضروری ہیں۔ صفائی کے کام یا خطرے والے کام کررہے والدین کے بچوں کے لیے حکومت نے پوسٹ میٹرک کے وظیفہ کی اسکیم چلا رکھی ہے۔ بیت الخلا کی صفائی کرنے والے، سیوریج کی صفائی کرنے والے، کوڑا اٹھانے والے، چمڑا رنگنے والے اور مین ہول و نالیوں کی صفائی کرنے والے ملازمین کے بچوں کو میٹرک کے بعد تعلیم حاصل کرنے کے لیے مالی تعاون دیا جاتا ہے۔ پسماندہ ذاتوں کے طلبا کے لیے بابو جگ جیون رام ہوسٹل اسکیم ہے۔ ریاستی حکومتیں مرکزی حکومت کی مدد سے اس طرح کے ہوسٹل کی تعمیر کرتی ہیں اور اسکولوں، کالجوں میں پڑھنے والے بچوں بچیوں کو رہنے کی سہولت فراہم کرتی ہیں۔ اقلیتی طلبا کے لیے مولانا آزاد قومی اسکالرشپ دی جاتی ہے۔ اس کے تحت ایم فل یا پی ایچ ڈی کرنے والے طالب علموں کو فیلوشپ دی جاتی ہے۔ اقلیتی طلبا کے لیے نیا سویرا کوچنگ اسکیم بھی ہے۔ اس میں سول سروس کی تیاری کرانے کے لیے مختلف اداروں کو مرکزی سرکاری مالی امداد دیتی ہے۔ ان اداروں میں اقلیتی طلبا کو مفت کوچنگ دی جاتی ہے۔ لڑکیوں کو مولانا آزاد اسکالرشپ اسکیم کے تحت میٹرک پاس کرنے کے بعد 11 ویں اور 12 ویں میں 6000 روپے سالانہ دیے جاتے ہیں۔ پڑھو پردیش بھی ایک اچھی اسکیم ہے جس کے تحت طالب علم ملک کے باہر جا کر تعلیم حاصل کرسکتا ہے۔ استاد اسکیم کے تحت اقلیتوں کے بچوں کو پیشہ ورانہ ہنر کی تربیت دی جاتی ہے تاکہ وہ اپنی روزی روٹی خود سے چلا سکیں۔ نئی منزل اسکیم کے ذریعہ اسکول چھوڑ چکے بچوں کو پھر سے تعلیم کی طرف واپس لا کر انھیں روزگار مہیا کرایا جاتا ہے۔ مرکزی حکومت نے مدرسوں کی جدید کاری اور تعلیمی معیار کو بہتر بنانے کی بھی کوشش کی ہے۔ کستور با بالیکا ودھیالیہ اسکیم بھی اقلیتوں اور پسماندہ ذاتوں کے لیے ہے اس کے تحت قائم اسکولوں میں اقلیتوں اور پسماندہ برادری سے تعلق رکھنے والی بچیوں کو تعلیم دی جاتی ہے۔ ان اسکیموں کے علاوہ نئی اڑان، سیکھو اور کماؤ، نئی روشنی، ہماری دھروہر اسکیم، ڈیجیٹل خواندگی، ساکشر بھارت، جن شکشا سنستھان، مولانا آزاد نیشنل اکیڈمی برائے مہارت بھی حکومت کے ایسے پروگرام ہیں جن سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔

پیارے بچو! ان اسکیموں کے تعارف کا مقصد یہ ہے کہ آپ سب بھی ان پروگراموں سے باخبر رہیں اور فائدہ اٹھائیں۔ ان اسکیموں کی مزید جانکاری آپ انٹرنیٹ سے بھی حاصل کرسکتے ہیں۔ اب آپ بچوں کی دنیا پڑھیں۔ تازہ شمارے میں ہم نے نومبر کی مناسبت سے کچھ تحریریں شامل کی ہیں ساتھ ہی اچھی اچھی کہانیاں بھی۔ اپنے تاثرات ضرور بھیجیں آپ کی رائے اور مشوروں کا ہمیں انتظار رہے گا۔

آپ کا

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

ڈاک خانہ

ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' آپ کی زیرادارت مقبولیت حاصل کررہا ہے۔ اس رسالے کی وجہ سے نئی نسل میں اردو سے محبت میں اضافہ ہورہا ہے۔ ہر شمارے میں مضامین، کہانیاں اور نظمیں دلچسپ ہوتی ہیں۔ آپ کے رسالے نے ماہنامہ 'کھلونا' کی کمی کو دور کردیا۔ پرخلوص مبارکباد۔

اسد رضا، F-97، سیکٹر 7، جسولہ وہار، نئی دہلی 25

ماہ جولائی کا 'بچوں کی دنیا' کا شمارہ اپنے جلو میں دلچسپ کہانیوں کے حسین گلدستے اور ڈھیر ساری قیمتی معلومات کے ساتھ باصرہ نواز ہوا۔ تازہ شمارہ اپنے مشمولات کے اعتبار سے بے حد مفید اور تربیتی ہے۔ 'بچوں کی دنیا' کا مقصد چونکہ نونہالان قوم کی ذہنی وفکری تربیت ہے، اس لیے قارئین رسالہ کو اپنی تخلیقات سے اسے زینت بخشنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

ہمارا یقین ہے کہ اس رسالے کے مستقل قارئین کے لیے رسالہ بہترین اور خالص اردو لکھنے اور بولنے کا دروازہ کھولے گا۔ وقتاً فوقتاً 'بچوں کی دنیا' میں ایسے مضامین کی اشاعت کو بھی یقینی بنانا چاہیے جن کا تعلق زبان و بیان کی تصحیح سے ہو۔ بہت سارے الفاظ اپنے اصل معنی سے ہٹ کر اور بہت ساری ترکیبیں غلط صورت میں رائج ہوگئی ہیں۔ ان چیزوں پر ماہرین فن گرفت بھی کرتے رہتے ہیں۔ 'بچوں کی دنیا' کے قارئین کے لیے بھی ان چیزوں کو سہل الفہم بنا کر پیش کرنا چاہیے تاکہ 'بچوں کی دنیا' کے جلو میں پروان چڑھ رہی نئی نسل بھی زبان و بیان کی ان باریکیوں سے واقف ہوسکے۔ قارئین کے لیے بچوں کی دنیا

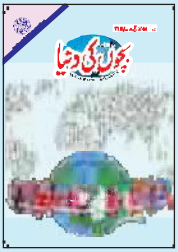

اپنی تخلیقات کی اشاعت کا سنہری موقع فراہم کرتی ہے۔ اس سے فائدہ اٹھانے اور اپنی مخفی تحریری وفکری صلاحیت کو نشو دینے کی ضرورت ہے۔ اس طرح ہم امید کرسکتے ہیں کہ ہماری یہ نسل کبھی اردو کے دامن کو بہترین کاتب اور خطیب سے محروم نہ ہونے دے گی۔ اردو زبان کا سہاگ ان نونہالان قوم کی ان عملی کاوشوں سے قائم ودائم رہے گا۔

جوہر جاوید، بھدریہ، گیا، بہار

ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' نے آج بلاشبہ اپنی بہترین شناخت بنالی اور نمبر ایک کی دعوے داری پیش کردی ہے۔ اس کی چھوٹی چھوٹی سبق آموز کہانیاں، موسم اور محبت سے لبریز نظمیں، مضامین، رنگین تصویریں، خوبصورت سرورق، اور بچوں کے لیے ڈھیر ساری دلچسپ معلومات، سفید اور رنگین کاغذ، بہترین، صاف اور شفاف کتابت جو غلطیوں سے پاک ہے اور اسی وجہ سے یہ سب کا پسندیدہ ہے۔ میرے گھر میں میرے نواسے، پوتے، نواسیاں اور پوتیوں کے علاوہ ان کے والدین یعنی میری بیٹیاں اور بیٹے بھی 'بچوں کی دنیا' کے شیدائیوں میں سے آ گئے ہیں۔

ملک بزمی، میٹروفٹ ویئر، بھوئی گلی، پوسٹ: ضلع پربھنی، مہاراشٹر

میں نے جولائی 2018 کا 'بچوں کی دنیا' پہلی بار پڑھا۔ مجھے کافی پسند آیا اور میں چاہتی ہوں یہ رسالہ مزید اور اچھا ہو۔ اس کے لیے میں اپنی کچھ رائے پیش کرنا چاہتی ہوں۔ یہ رسالہ بچوں کے لیے ہے تو یہ اور رنگین ہو اس کے لیے اس میں زیادہ سے زیادہ کلرفل تصویریں شائع کی جائیں کیونکہ 'بچوں کی دنیا' ان کے خوابوں کی طرح حسین اور کلرفل ہوتی ہے۔ ایسا رسالہ

بچوں کو زیادہ attract کرے گا۔ اس رسالے میں کہانیاں زیادہ ہوں اور کچھ سیکھ دینے والی ہوں۔ رسالے میں کچھ مقابلے بھی شامل کیے جائیں جن کی وجہ سے بچے ہر مہینے اس سے جڑے رہیں اور ان کا دماغ روشن ہو۔ اس میں سوال جواب کہ اور بہترین تصویری مقابلہ شامل کیا جاسکتا ہے۔ ان مقابلوں سے بچے زیادہ سے زیادہ جڑیں گے۔

صہبا خاتون، بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر، اوکھلا، نئی دہلی 25

’بچوں کی دنیا‘ کا تازہ شمارہ پڑھا۔ اتنا خوبصورت اور رنگین پرچہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی، بچوں کی دنیا دن بدن مقبولیت حاصل کر رہا ہے اور بچے بھی اسے بہت شوق اور دلچسپی سے پڑھتے ہیں، ’بچوں کی دنیا‘ میں اتنی دلچسپ کہانیاں ہوتی ہیں جس کا کوئی جواب ہی نہیں اور اکثر الگ الگ topic پر کہانیاں پڑھنے کو ملتی ہیں۔ آپ کا اداریہ بہت پسند آیا۔ آپ بہت بیباکی سے لکھتے ہیں اور اس شمارے میں بھی آپ نے استاد کی اہمیت کو بہت کھل کر پیش کیا ہے۔ سبھی کہانیاں نصیحت آموز ہیں۔ کچھ کہانیاں تو بہت پسند آئیں۔ کہانی ’میرے استاذ‘ پروفیسر عبدالحمید بہت اچھی لگی۔ جس طرح انھوں نے اپنے استاد کے کردار کو پیش کیا ہے وہ قابل مطالعہ ہے۔ استاد کی عظمت کو سلام بھی بہت خوب ہے۔ کہانی میں انھوں نے سکندر اور ارسطو دونوں شاگرد اور استاد کے کردار سے مثال دی ہے۔ وہ بہت اچھا لگا اور یہ کہانی ہمیں ہمارے استاد کی عزت کرنے کی ہدایت بھی دیتی ہے۔ قدرت کا انمول تحفہ ’پانی‘ بہت معلوماتی کہانی ہے۔ ہمیں قدرت نے کیا کچھ نہیں دیا۔ پیڑ، پودے، ندیاں، آسمان، پھل، پھول اور ایک اچھی زندگی لیکن ہم قدرت کو بہت نقصان پہنچا رہے ہیں۔ روز پیڑ کاٹے جا رہے ہیں، ندیوں میں اتنی گندگی پھینکی جارہی ہے جس سے آلودگی کی سطح بڑھتی ہی جا رہی ہے اور ہمیں اپنے ماحول کے بچاؤ کے لیے کوشش کرنا ضروری ہے۔ پہلے کام، پھر آرام بھی نصیحت آموز کہانی ہے اور یہ کہانی بچوں میں پہلے کام، پھر آرام کرنے کا جذبہ بھی پیدا کرتی ہے۔

استوتی اگروال، اگروال جیولرس، سرونج مدھیہ پردیش۔ 28

ماہنامہ ’بچوں کی دنیا‘ کا جولائی 2018 کا شمارہ نظروں سے گزرا۔ اس سے قبل بھی بچوں کی دنیا کے دوسرے شمارے دیکھتا رہا ہوں جو دیدہ زیب سرورق، عمدہ مواد اور اعلیٰ طباعت کا نمونہ ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ اس میں بچوں کی خوبصورت دنیا کو سمیٹ کر رکھ دیا گیا ہو۔ مختلف موضوعات سے بھرا ہوا یہ شمارہ بچپن کی یاد تازہ کرتا ہے۔ سبق آموز کہانیاں، معلوماتی مضامین رسالے کو مزید دلچسپ بناتے ہیں۔ جولائی کے شمارے میں معلومات سے بھرپور احرار حسین کا مضمون ’لیزر سرجری‘ کافی اہم ہے، فیفا فٹ بال ورلڈ کپ کے تعلق سے سید پرویز قیصر کا مضمون بھی معلوماتی ہے۔ محسن رضا کا مضمون ’ڈارون‘ پڑھنے کے لائق ہے۔ ’آئس کریم کی کہانی‘ اور ’مشہور عمارتیں‘ بھی دلچسپ اور معلوماتی ہیں۔ مرزا حامد بیگ کی کہانی ’ایک تھی بڑھیا‘ نصیحت آمیز ہے۔ شمارے میں کہانیوں، نظموں اور بچوں کی حوصلہ افزائی کے لیے بچوں کے ذریعہ بنائی گئی پینٹنگ کو جگہ دے کر مزید دلچسپ بنا دیا گیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ رسالہ ’بچوں کی دُنیا‘ مختلف خوبصورت پھولوں کا ایک گلدستہ ہے۔

مظہر حسنین، فیچر ایڈیٹر روزنامہ میرا وطن، نئی دہلی

ماہنامہ ’بچوں کی دنیا‘ بچوں کے ادبی جرائد میں گرانقدر اضافہ ہے۔ انشاء اللہ یہ میل کا پتھر ثابت ہوگا۔ تمام قلم کاروں اور جملہ اراکین کو رسالہ کی شاندار کامیابی کے لیے مبارکباد!

معزالدین ماجد، وسیع آباد، الہ آباد، اتر پردیش

انصار احمد درویش

مولانا ابوالکلام آزاد

عزیز بچو! آج ہم آپ کو ایک ایسے شخص کے بارے میں بتائیں گے جو ہندوستان کی تحریک آزادی میں ایک بلند مقام رکھتے ہیں اور جنھوں نے آزادی کے مردہ جسم میں روح پھونک دی۔ جی ہاں اس شخص کو دنیا امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کے نام سے جانتی ہے۔ ابوالکلام کی پیدائش مکہ معظّمہ میں ہوئی۔ ان کا بچپن حجاز کی مقدس وادیوں میں گزرا جہاں اور وہیں ان کی ابتدائی تعلیم ہوئی۔

مولانا بچپن سے ہی نہایت ذہین تھے، ان کی ذہانت کا یہ عالم تھا کہ ان کے ہم جماعت طلبا ان کا ساتھ نہیں دے پاتے تھے۔ لہٰذا انھیں ترقی دے کر طلبا کی اگلی جماعت میں شامل کر لیا جاتا اور قلیل عرصے میں اگلی جماعت کے یہ طلبا بھی ان کے آگے کمزور ثابت ہوتے تھے۔ اس تیز رفتاری کا نتیجہ یہ ہوا کہ صرف چودہ برس کی عمر میں وہ درس نظامی کی شرح سے فارغ ہو گئے اور ادبیات، منطق، فقہ اور حدیث کے مضامین پر انھیں عبور حاصل ہوگیا۔ اس زمانے میں عام طور پر یہ خیال رائج تھا کہ جب تک فارغ التحصیل طالب علم دوسرے طلبا کو نہ پڑھائے اپنے مضمون میں اسے پختگی حاصل نہیں ہوتی اس لیے کچھ طلبا کے پڑھانے کا کام ان کے سپرد کیا گیا جنھیں وہ درس دینے لگے۔

مولانا آزاد کی ذہانت و فطانت کا اعتراف پنڈت نہرو اور مہاتما گاندھی وغیرہ نے تو کیا ہی ہے بلکہ بلبل ہند سروجنی نائڈو نے بھی اپنے شاعرانہ انداز میں کیا۔ انھوں نے لکھا کہ ”آزاد کی عمر پیدائش کے وقت پچاس برس کی تھی“ پیارے بچو! اس بات کا قطعی یہ مطلب نہیں کہ مولانا

آزاد پچاس برس کے پیدا ہوئے تھے، ہرگز نہیں بلکہ اس سے یہ مراد ہے کہ وہ عہد طفلی و طالب علمی کے دور میں ایسے ذہین تھے کہ جتنی ذہانت لوگوں کو ایک عمر گذارنے کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ ان کے بچپن کا ایک اور واقعہ جو ان کی منجھلی بہن فاطمہ بیگم آرزو بتاتی ہیں کہ ''ان کے کھیل سات آٹھ سال کی عمر میں عجب انداز کے ہوا کرتے تھے۔ مثلاً وہ کبھی گھر کے تمام

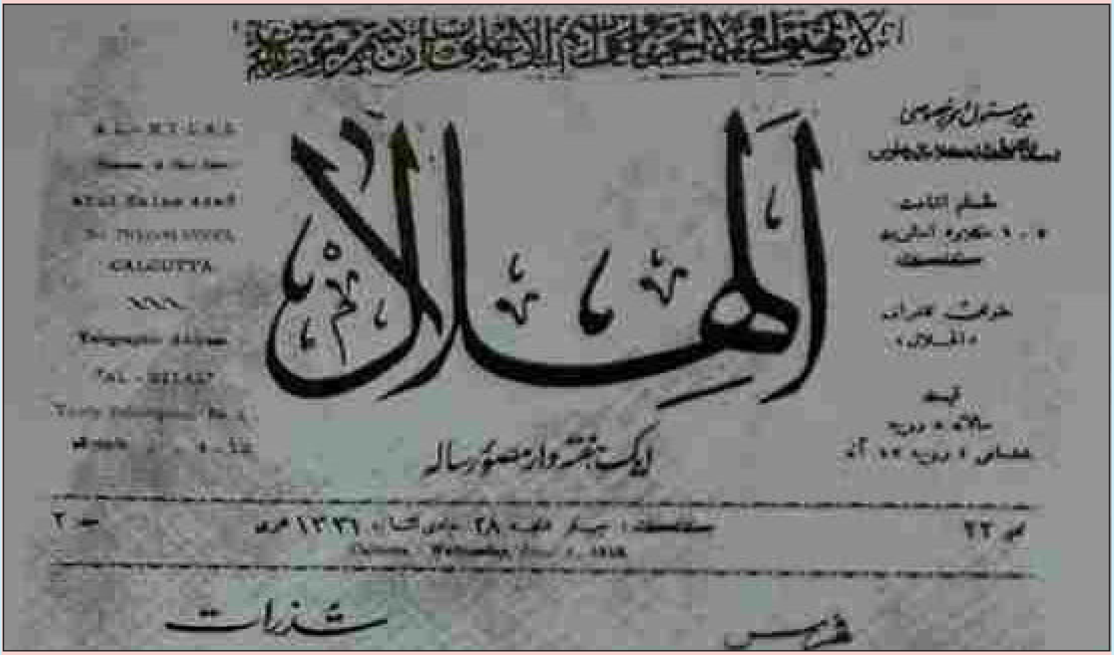

صندوقچوں اور بکسوں کو ایک لائن میں رکھ کر کہتے کہ یہ ریل گاڑی ہے۔ پھر والد کی پگڑی سر پر باندھ کر بیٹھ جاتے اور ہم بہنوں سے کہتے کہ تم چلا چلا کر کہو ہٹو ہٹو راستہ دو دلی کے مولانا آ رہے ہیں... کبھی وہ گھر میں اونچی چیز پر کھڑے ہو جاتے اور سب بہنوں کو آس پاس کھڑا کر کے کہتے کہ تم لوگ تالیاں بجاؤ اور سمجھو کہ ہزاروں آدمی میرے چاروں طرف کھڑے ہیں اور میں تقریر کر رہا ہوں اور لوگ میری تقریر سن کر تالیاں بجا رہے ہیں۔ میں کہتی تھی کہ بھائی سوائے ہم دو چار کے یہاں اور کوئی نہیں ہے ہم کیسے سمجھیں کہ ہزاروں آدمی یہاں کھڑے ہیں۔ اس پر وہ کہتے تھے کہ یہ تو کھیل ہے''۔

دیکھا بچو! آپ نے کس طرح کھیل کھیل میں انھوں نے اپنے بچپن میں ہی ملک کی آزادی اور غلامی سے نجات حاصل کرنے کا تصور ہمیں دے دیا تھا۔ بچپن کے اس مبارک خواب کو سچ کرنے کے لیے وہ تحریک آزادی میں تن من دھن سے جٹ گئے۔ آزادی کے اس مشن کو سب سے پہلے انھوں نے اپنے رسالے 'الہلال' سے شروع کیا۔ ان کا یہ رسالہ آزادی کی روح سے بھرا تھا۔ ملک کے بڑے بڑے ادیب و شاعر اور دانشوروں کو اس رسالے کا انتظار رہتا تھا۔ علامہ اقبال جیسی عبقری شخصیت بھی اس کی خریدار ہوئی اور دوسرے لوگوں کو بھی اس کے خریدار بننے کی ترغیب دی۔ تقریباً ایک سال کی مدت تک نکلنے کے بعد الہلال کو انگریزوں کی بری نظر لگ گئی اور انھوں نے اس ہفتہ وار رسالے کو ضبط کر لیا، ساتھ ہی اس کی

تمام کاپیاں بھی ضبط کر کے ضائع کر دیں۔

الہلال کے بند ہونے پر مولانا آزاد کی روح بے چین ہوگئی اور انھوں نے 1914 میں ایک دوسرا ہفتہ وار رسالہ 'البلاغ' نکالنا شروع کیا۔'البلاغ' الہلال کی طرح جوش و جذبات سے بھرا ہوا تو نہیں تھا۔ وجہ یہ تھی کہ اگر مولانا اسے بھی اسی طرز پر نکالتے تو انگریز اس رسالے کو بھی ضبط کر لیتے لیکن حقیقت میں اس اخبار کا مشن بھی الہلال ہی کی طرح ملک وقوم کو انگریزوں کے ظلم سے آزادی دلانا تھا۔لیکن یہ رسالہ بھی چار مہینے کی کم مدت تک نکلنے کے بعد بند ہوگیا۔

رسالے تو نکلنے بند ہو گئے تھے لیکن مولانا کی بے چین فطرت میں جو آزادی کا جوہر پیدا ہو گیا تھا اس میں بجائے کمی ہونے کے اضافہ ہی ہوتا گیا۔ ان کے اسی جذبے نے انھیں بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں ملک کے عظیم سیوک مہاتما گاندھی سے ملایا جن کے ساتھ مولانا 'خلافت تحریک'، 'عدم تعاون تحریک یا ترک موالات'، 'سول نافرمانی' اور 'بھارت چھوڑو' جیسی بڑی تحریکات کا حصہ رہے۔ان تحریکوں اور ملک کی آزادی کے لیے انھیں کئی مرتبہ جیل بھی جانا پڑا۔ اس کے باوجود بھی اس مردِ مجاہد، یکجہتی کے طرفدار شخص کے پیروں میں لڑکھڑاہٹ تک نہ آئی اور مسلسل وہ اپنی منزل کی جانب بڑھتا رہا۔

آزادی کے لیے انھیں بہت ساری دقتوں اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کے سامنے سب سے بڑی پریشانی یکجہتی کی تھی۔ کیونکہ ان کی دوررس نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ جب تک ہندو مسلم اتحاد نہیں ہوگا اور یہ دونوں قومیں ایک قوم بن کر انگریزی ظلم وستم کا مقابلہ نہیں کریں گی اس وقت تک ملک انگریزوں کی غلامی سے آزاد نہیں ہوگا۔ ہندو مسلم اتحاد کی خاطر مولانا ابوالکلام آزاد کو لوگوں کی باتیں بھی سننی پڑیں۔ دونوں فرقوں کی جانب سے اتحاد کے راستے میں روڑے ڈالے گئے، مولانا آزاد کی مجلسوں میں رخنے ڈالے گئے۔ یہاں تک کہ محمد علی جناح نے انھیں show boy تک کہہ دیا۔لیکن اس کے باوجود بھی انھوں نے کسی کا جواب تک دینا گوارا نہ کیا بلکہ اپنے چنے ہوئے راستے پر مسلسل ڈٹے رہے۔

حیران کُن بات اس وقت سامنے آئی جب انگریز حکومت کی پالیسی 'بانٹو اور حکومت کرو' کے تحت کچھ بچولیوں (انگریزوں کے ایجینٹ) نے مولانا سے کہا کہ'' آزادی تو مل جائے گی لیکن شرط یہ ہے کہ آپ ہندو مسلم اتحاد کا بیڑا چھوڑ کر صرف اپنی کمیونٹی کی بات کریں''۔ یہ سن کر مولانا آزاد آگ بگولہ ہو گئے اور ایسی بے تکی باتوں کا جواب انھوں نے 1923 کے انڈین نیشنل کانگریس کی جانب سے منعقدہ خصوصی اجلاس، دہلی سے خطاب فرمایا اور کہا کہ'' ہندو مسلم ایکتا کے بغیر ہمیں قومی آزادی نہیں مل سکتی بلکہ اس کے بغیر ہم انسانیت کے ابتدائی اصول بھی اپنے اندر پیدا نہیں کر سکتے۔ اگر آج ایک فرشتہ آسمان کی بلندیوں سے اتر آئے اور قطب مینار پر کھڑے ہو کر یہ اعلان کرے کہ سوراج 24 گھنٹے کے اندر مل سکتا ہے بشرطیکہ ہندوستانی ہندو مسلم اتحاد کی بات کرنا چھوڑ دیں تو میں سوراج سے دست بردار ہو جاؤں گا۔مگر اس سے دست بردار نہیں ہوں گا کیونکہ اگر سوراج ملنے میں تاخیر ہوگی تو یہ ہندوستان کا نقصان ہوگا لیکن اگر ہمارا اتحاد جاتا رہا تو عالم انسانیت کا نقصان ہوگا''۔

■

Ansar Ahmad
A39/305 A-4 Lat Bhairo Saraiyan
Varanasi - 221001 (UP)

عبدالرزاق دل

چاچا نہرو

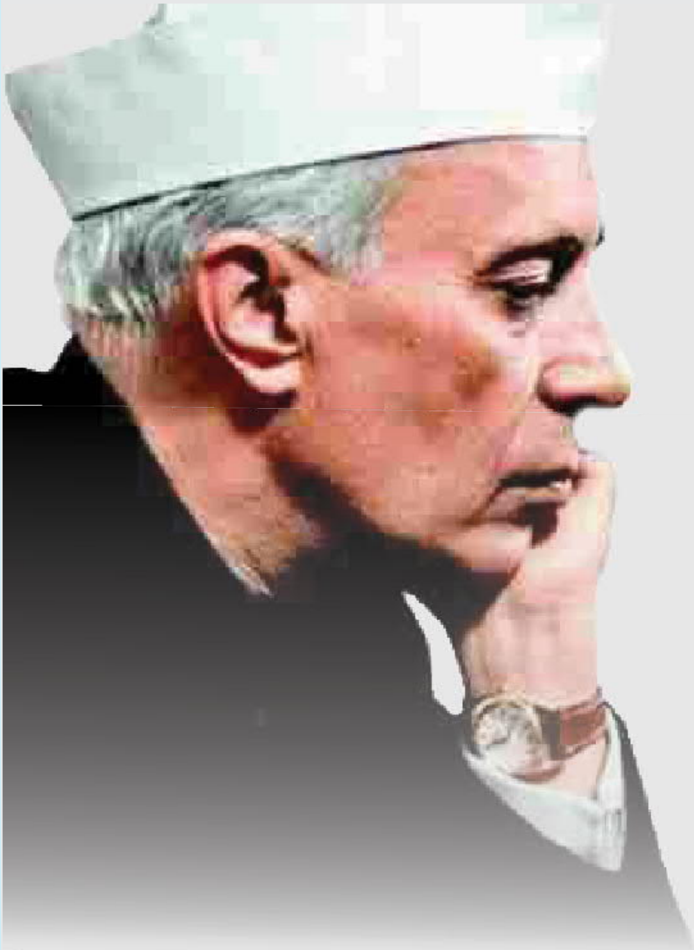

نام جواہر لعل تھا جن کا
چودہ نومبر جنم دن ان کا
یہ بچوں کا دن کہلائے
نہرو جی کی یاد دلائے
بچو! اعلیٰ حسب نسب تھا
اور نہرو خاندانی لقب تھا
الہ آباد تھی جائے پیدائش
اور آنند بھون میں رہائش
من میں دکھاوا تھا نہ نمائش
بس آزادی کی تھی خواہش
دیش کی شان نہ کھونے دیتے
ظلم کبھی نہ ہونے دیتے
دیش کے پہلے وزیراعظم
سب کے چہیتے سب کے ہمدم
جواہر لعل تھے قول کے سچے
جن کو چاچا کہتے بچے

■

Abdur Razzaq Dil
Village & Post: Kholapur - 444802
Distt.: Amrawati (Maharashtra)

محمد گلزار عالم

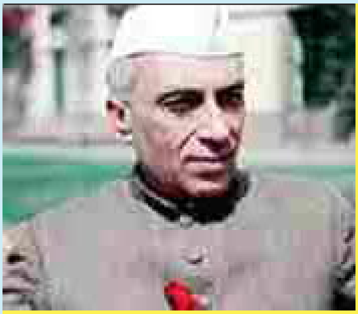

ماہ نومبر
کی تاریخی و ادبی اہمیت

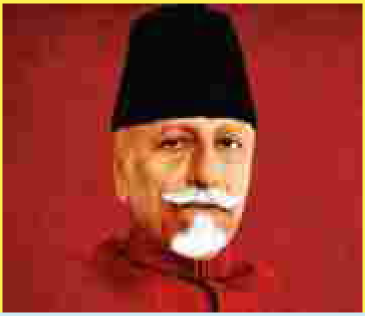

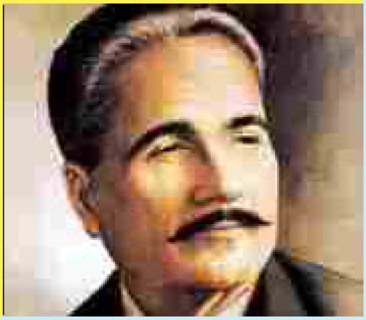

پیارے بچو! وطن عزیز ہندوستان میں ہر ماہ کی اپنی ایک الگ خصوصیت اور پہچان ہے لیکن نومبر کا مہینہ اپنی تاریخی اور ادبی اعتبار سے ایک منفرد حیثیت کا حامل ہے۔ ملک کو غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرانے والے کئی جیالوں، دانشوروں اور مفکرین کی تاریخ پیدائش اسی ماہ میں ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد، اندرا گاندھی، رانی لکشمی بائی اور علامہ اقبال کی پیدائش نومبر کے مہینے میں ہی ہوئی۔

آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کی پیدائش 14 نومبر 1889 کو الہ آباد میں ہوئی۔ آپ کے والد محترم موتی لال نہرو ایک کامیاب بیرسٹر تھے۔ والدہ کا نام سواروپ رانی تھسّو تھا۔ پنڈت جواہر لال نہرو کی شادی فریڈم فائٹر کملا کاؤل سے ہوئی۔ ہندوستان کی آزادی کی جدو جہد میں آپ بھی پیش پیش رکھے اور وطن کے جیالوں کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلتے رہے۔ آپ کو بچوں سے بڑی انسیت تھی۔ بچے بھی آپ کو چاچا نہرو کہہ کر پکارتے تھے۔ بچوں سے ملنا، ان سے باتیں کرنا، ان کے ساتھ وقت گزارنا آپ کا محبوب مشغلہ تھا۔ بچوں کے ساتھ آپ کا جذباتی اور فطری لگاؤ تھا۔ چاچا نہرو کو گلاب کا پھول بے حد پسند تھا۔ حکومت ہند نے 1955 میں آپ کو ملک کے سب سے بڑے سیویلین ایوارڈ 'بھارت رتن' سے سرفراز کیا۔ جواہر لعل نہرو نے 27 مئی 1964 کو آخری سانس لی۔ بچوں سے بے انتہا محبت اور لگاؤ کی وجہ سے آپ کی تاریخ پیدائش کو پورے ہندوستان میں 'یوم اطفال' کے طور پر منایا جاتا ہے۔

مولا نا ابوالکلام آزاد کے والد مولانا خیرالدین کی پیدائش دہلی میں ہوئی۔ تقریباً 25 سال کی عمر میں ہجرت کر کے مکہ معظّمہ چلے گئے۔ وہیں مولانا ابوالکلام آزاد کی پیدائش 11 نومبر 1888 کو ہوئی۔ ملک کی خوشبو مولانا خیرالدین کو کھینچ کر ہندوستان لے آئی۔ مولانا ابوالکلام آزاد غیر معمولی صلاحیتوں

کے مالک تھے۔ان کی زندگی کا ایک قیمتی حصہ جیل میں گزرا۔ سترہ سال کی عمر سے ہی ان کے سیاسی خیالات میں تبدیلی آنی شروع ہوگئی۔وطن عزیز کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑا دیکھ کران کا دل بے چین ہو جاتا تھا۔ہندوستان کو برطانوی سامراجیت سے آزاد اور پاک کرنے کے لیے سنہ 1905 میں بنگال کے انقلابی رہنما شیام سندر چکرورتی اور اروندو گھوش کی رہنمائی میں سیاست کے میدان میں قدم رکھا۔ہندوستانی نوجوانوں کے اندر آزادی کا جوش و جذبہ پیدا کرنے اور برطانوی حکومت کی جڑیں کمزور کرنے کے لیے مولانا نے 13 جولائی 1912 کو ایک اخبار ’الہلال‘ جاری کیا۔الہلال اور البلاغ کی اشاعت سے انگریزی حکومت خوف زدہ ہوگئی۔مولانا پر کئی طرح کی پا بندیاں عائد کی گئیں۔انھیں بنگال سے چلے جانے کا بھی حکم دیا گیا لیکن ان کے جذبہ آزادی میں ذرا بھی کمی نہیں آئی بلکہ وہ ایک مرد مجاہد کی طرح ڈٹے رہے۔1923 میں 35 سال کی عمر میں انڈین نیشنل کانگریس کے صدر بنے۔گاندھی جی کی تحریک ’ہندوستان چھوڑو‘ کی بھرپور اور کھل کر حمایت کی جس کے لیے انہیں احمد نگر قلعہ میں قید کر دیا گیا۔1942 سے 1945 کے زمانہ میں دل کا غبار نکالنے کے لیے اپنے دوست حبیب الرحمٰن شیروانی کے نام خط لکھا کرتے تھے جو بعد میں ’غبار خاطر‘ کے نام سے چھپا۔مولانا ابوالکلام آزاد کو کشتیِ آزادی کا ملاح بھی کہا جاتا ہے۔15 اگست 1947 کو آپ آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم بنے اور 2 فروری 1958 تک اپنے فرائض کو نبھایا۔تعلیمی میدان میں آپ نے بے شمار اصلاحات کیں۔ ’انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی‘ کا قیام عمل میں لائے۔اعلی تعلیمی اداروں کی نگرانی اور سرپرستی کے لیے یو جی سی کو بنایا۔ آپ کی تعلیمی خدمات کو دیکھتے ہوئے حکومت ہند نے 2008 میں آپ کی تاریخ پیدائش کو ’قومی یوم تعلیم‘ کے طور پر منانے کا فیصلہ کیا۔آج بڑے جوش وخروش کے ساتھ ملک بھر کے تعلیمی اداروں میں یوم تعلیم کا اہتمام کیا جاتا ہے۔آپ کو 1992 میں ’بھارت رتن ایوارڈ‘ عطا کیا گیا۔مولانا چائے کے بڑے شوقین تھے۔بغیر دودھ والی چائے پسند فرماتے تھے۔پھولوں میں وائٹ جاسمین پسند کرتے تھے۔ہندوستان کے اس عظیم سپوت کا انتقال 22 فروری 1958 کو دہلی میں ہوا۔

ڈاکٹر سر محمد اقبال جنھیں دنیائے ادب شاعر مشرق، شاعر اسلام اور حکیم الامت کے نام سے جانتی ہے۔آپ کی پیدائش 9 نومبر 1877 کو سیالکوٹ میں ہوئی۔آپ کے آبا و اجداد

کشمیری برہمن تھے۔ والد کا نام نور محمد اور والدہ کا نام امام بی بی تھا۔ گھر کے مذہبی اور صوفیانہ ماحول میں آپ کی پرورش اور تربیت ہوئی۔ 1883 میں اسکاچ مشن اسکول میں داخلہ لیا۔ 1907 میں میونخ یونیورسٹی (جرمنی) سے پی ایچ ڈی کی ڈگری لی۔ علامہ اقبال کو کم عمری سے ہی شعر گوئی کا شوق تھا۔ داغ دہلوی سے شاعری میں اصلاح لینی شروع کی۔ شروع شروع میں آپ کی شاعری کا موضوع عشق مجازی تھا لیکن بہت جلد نیچر، وطن اور حقیقی زندگی کے مسائل کی طرف متوجہ ہوئے۔ قوم کے نوجوانوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لیے بہت ساری نظمیں لکھیں۔ اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعہ حب الوطنی کے جذبات ابھارنے اور قوم کو دعوت عمل دینے کے لیے بے شمار نظمیں تحریر کی ہیں۔ جن میں نیا شوالہ، ترانۂ ہندی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ آپ نے بچوں کے لیے بھی نظمیں کثرت سے لکھی ہیں۔ بچے کی دعا، ماں کا خواب، پرندے کی فریاد، ایک پہاڑ اور گلہری، ایک مکڑی ایک مکھی، ایک گائے اور بکری، ہندوستانی بچوں کا قومی گیت اہم ہیں۔ آپ نے اپنی شاعری سے بار ہا جہد مسلسل اور عمل پیہم کا پیغام دیا ہے۔ برطانوی حکومت نے آپ کی شاعرانہ خدمات کے اعتراف میں 1923 میں 'سر' کا خطاب عطا کیا۔ بانگ درا، بال جبرئیل اور ضرب کلیم آپ کے شعری مجموعے ہیں۔ ایک طویل علالت کے بعد آپ کا انتقال 21 اپریل 1938 کو ہوا۔

■

Mohd Gulzar Alam
Rail Paar, Jahangeeri Mohalla
KT Road, Asansol
Distt : Barduwan - 713302 (West Bengal)

جوابات

تہوار روشنی کا

آیا ہے پھر سے دیکھو تہوار روشنی کا
ایثار اور اخوّت، پیار اور دوستی کا

پہنے ہوئے ہیں سب نے خوش رنگ اجلے کپڑے
من بھی دھلا دھلا ہے شفاف ہر کسی کا

سب مسکرا رہے ہیں خوشیاں منا رہے ہیں
یوں ہی رہے یہ گلشن امن اور آشتی کا

اس ملک میں چراغ اب ایسا بھی اک جلادو
جس سے مٹے تعصب دل صاف ہو سبھی کا

اس دیس میں ہو اونچا امن و اماں کا پرچم
نا ظلم ہو کسی پر یہ ملک ہے سبھی کا

بچّو! جلاؤ شعلہ ایسا کہ اب جہاں سے
مٹ جائیں ظلمتیں اور فتنہ تعصبی کا

ہر دل میں اب جلادو قندیل روشنی کی
بن جائے یہ گلستاں خوشحالی و خوشی کا

جی اٹھے پھر سے اپنا صدیوں کا بھائی چارہ
اِس سال ہو یہی بس تحفہ دیپاولی کا

■

Dr. Asrarullah Ansari
Asst. Prof. MLC Govt. Girls PG College
Khandwa - 450001 (MP)

خواجہ احمد عباس

چاچا نہرو گھوڑے سے گرے

چاچا نہرو کی ایک مشہور تصویر ہے جو کسی کانفرنس کے موقعے پر شملہ میں لی گئی تھی۔ اس میں وہ چوڑی دار پاجامہ، کالی شیروانی اور گاندھی ٹوپی پہنے ایک سفید گھوڑے پر سوار ہیں۔

شملہ میں اس زمانے میں موٹریں بالکل نہیں چلتی تھیں۔ صرف تین موٹروں کو مال روڈ سے ہوکر وائسریگل لاج تک جانے کی اجازت تھی۔ ایک تو 'لاٹ صاحب' یعنی وائسرائے کی موٹر۔ ایک کمانڈر اِن چیف کی موٹر۔ اور ایک پنجاب کے گورنر کی موٹر۔ باقی سب لوگوں کو پہاڑی راستوں پر پیدل چلنا پڑتا تھا۔ جو کمزور یا بوڑھے ہوتے تھے وہ ڈانڈی میں بیٹھتے تھے۔ جس کو چار کہار ڈولی کی طرح اٹھاتے تھے۔ یا رکشے میں بیٹھتے تھے جس کو گھوڑوں کی بجائے آدمی گھسیٹتے تھے۔

جواہر لال نہرو رکشا یا ڈانڈی میں بیٹھنے کو بہت برا سمجھتے تھے۔ وہ کہتے ''یہ بھی بھلا کوئی بات ہے کہ ایک انسان کو دوسرے انسان کندھوں پر اٹھائیں یا جس رکشے میں ایک انسان بیٹھے اس کو دوسرے انسان گھوڑوں یا بیلوں کی طرح گھسیٹیں۔ رکشے اور ڈانڈی دونوں کا رواج انسان اور انسانیت کی توہین ہے۔'' اس لیے جب بھی ان کو کسی پہاڑی مقام پر جانے کا اتفاق ہوتا تھا تو وہ رکشے میں سوار ہونے یا ڈانڈی میں بیٹھنے کی بجائے گھوڑے پر سوار ہوکر گھومتے تھے۔

ایسا ہی انھوں نے اس برس (یہ آزادی سے پہلے کی بات ہے) شملہ میں کیا۔ جو گھوڑا انھوں نے اپنی سواری کے لیے پسند کیا تھا۔ وہ نہ صرف سفید تھا بلکہ بڑا مضبوط اور خوب صورت بھی تھا۔ جب جواہر لال نہرو اس پر سوار ہوکر شملہ کی سڑکوں سے گزرے تو لوگ مڑ مڑ کر دیکھتے۔ جیسا خوب صورت گھوڑا ویسا ہی خوب صورت سوار۔ گھوڑے پر بیٹھتے بھی تھے۔ فوجی سواروں کی طرح اور گھوڑا بھی فخر سے سر اٹھا کر چلتا جیسے اسے احساس ہو کہ کتنا بڑا آدمی اس پر سواری کر رہا ہے۔

کہتے ہیں کہ گھوڑا سوار کو پہچانتا ہے۔ جس طریقے سے سوار لگام کو کھینچتا ہے، جس طرح وہ رکاب میں پاؤں رکھتا ہے جس انداز سے وہ ایڑ لگاتا ہے، اُس سے گھوڑے کو معلوم ہوجاتا ہے کہ سوار اناڑی ہے یا شہ سوار۔ گھوڑے سے ڈرتا ہے، یا گھوڑے کو اپنا غلام سمجھتا ہے، یا پھر گھوڑے کو اپنا دوست سمجھتا ہے۔

جواہر لال نہرو جو سب انسانوں سے محبت کرتے تھے

(اور بچوں سے تو بے انتہا پیار کرتے تھے) جانوروں سے بھی محبت کرتے تھے، اور جانور بے زبان ہوتے ہوئے بھی ان کی محبت کی زبان سمجھتے تھے اور ان سے بہت جلد ہل جاتے تھے۔ وہ ہر گھوڑے کو جس پر وہ سوار ہوتے تھے، اپنا دوست سمجھتے تھے۔ نہ اسے ہوا سمجھ کر اس سے ڈرتے تھے، نہ اس پر ظلم کرتے تھے۔ چابک مارنا، ہنٹر چلانا، گھڑی گھڑی ایڑ لگانا وہ اچھے گھوڑے کی ہتک سمجھتے تھے اور اچھے سوار کی بھی۔

جواہر لال نہرو سات آٹھ برس کے تھے جب ان کے پتا موتی لال نہرو نے ان کو مردانہ کھیلوں اور ورزشوں کا شوق دلایا۔ ایک پہلوان ان کو پہلوانی کے گُر بتاتا تھا۔ ایک تیراک ان کو تیرنا سکھاتا تھا۔ آنند بھون میں جب تیرنے کے لیے تالاب بنا تو جواہر لال نہرو گھنٹوں اس میں تیرتے رہتے تھے، اور جو پانی سے ڈرتے تھے انھیں پانی میں گھسیٹنے اور پانی میں دھکیلنے میں انھیں بڑا مزہ آتا تھا۔ ان ہی دنوں میں ایک گھوڑ سوار فوج کا جوان ان کو گھوڑ سواری سکھانے کے لیے مقرر کیا گیا۔ ہر شام کو وہ ان کو گھوڑے پر سوار کرا کے دور تک لے جاتا۔ کبھی گھوڑے کو دُلکی چلواتا، کبھی سرپٹ دوڑواتا، کبھی قدم قدم چلواتا، کبھی جواہر لال نہرو سے کہتا، اترو، کبھی کہتا چڑھو، کبھی زین کسواتا، کبھی زین کے بغیر گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر بٹھاتا۔ غرض چند مہینے ہی میں اس نے بچے کو شہ سوار بنا دیا۔

مگر کہتے ہیں کہ جو گھوڑا سواری سیکھتا ہے تو اس کے لیے کم سے کم ایک بار گھوڑے سے گرنا ضروری ہوتا ہے۔ سو یہ جواہر لال نہرو کی ساتھ بھی ہوا۔ انھوں نے اس واقعہ کا ذکر اپنی 'آپ بیتی' میں کیا ہے۔ ایک شام کو جب وہ گھوڑے پر سوار ہو کر اپنے استاد کے ساتھ (جو دوسرے گھوڑے پر سوار تھے) جا رہے تھے۔ ان کا مونہہ زور عربی گھوڑا انھیں لے کر سرپٹ دوڑ پڑا۔ جواہر لال نہرو نے لگام کا سہارا لینا چاہا، لیکن گھوڑے نے پورے زور سے گردن کا جھٹکا دیا تو لگام ہاتھ سے نکل گئی— اور جواہر لال نہرو زمین پر آ رہے۔ گھوڑا بغیر سوار کے گھر واپس آ گیا۔

موتی لال نہرو اپنے دوستوں کے ساتھ ٹینس کھیل رہے تھے کہ انھوں نے دیکھا گھوڑا ہنہناتا ہوا خالی واپس آ رہا ہے۔ باپ ظاہر ہے پریشان ہو گئے کہ نہ جانے بیٹے پر کیا بیتی، ماں نے جب سنا تو ہو کر باہر نکل آئیں۔ باپ، ماں، باپ کے دوست، نوکر چاکر، پندرہ بیس آدمیوں کا جلوس جواہر لال نہرو کو ڈھونڈنے نکلا۔ تھوڑی دور ہی گئے تھے کہ سامنے سے دیکھا کہ جواہر لال چلے آ رہے ہیں۔ لنگڑاتے ہوئے کپڑوں پر سے مٹی جھاڑتے ہوئے۔ سب نے اور خاص کر باپ نے بہت آؤ بھگت کی جیسے بیٹا بہت بڑا میدان مار کر واپس آیا ہو۔

جواہر لال نہرو گھوڑے سے گر تو پڑے لیکن اگلے دن پھر اسی گھوڑے پر سوار ہوئے اور اس کو خوب بھگایا۔ لگام مضبوطی سے پکڑے رہے۔ گھوڑے کو بھی معلوم ہو گیا کہ میرے اوپر ایک بچہ سوار ہے لیکن یہ معمولی بچہ نہیں ہے، بہت بڑی شخصیت کا مالک ہے اور اس دن کے بعد جواہر لال نہرو سیکڑوں گھوڑوں پر سوار ہوئے— ہندوستان میں اور دوسرے ملکوں میں عربی گھوڑوں پر، روسی گھوڑوں پر، فوجی خچروں پر۔ پہاڑی ٹٹوؤں پر۔ لیکن کسی گھوڑے نے ان کو گرانے کی کوشش نہیں کی، کیونکہ انھیں معلوم تھا کہ ان پر جو سوار ہے یہ ان کا دوست ہے جو انسانوں سے، جانوروں سے، گھوڑوں سے محبت کرتا ہے اور ان کی عزت کرتا ہے۔

■

رونق جمال

گوپال کی دیوالی

شہر کے بازاروں میں دیوالی کی زبردست گہما گہمی ہوتی ہے۔ خاص کر رات میں بازاروں کی رونق میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔ جدھر دیکھو اُدھر خرید و فروخت کا بازار گرم رہتا ہے۔ بازار میں من پسند سامان سیل میں ملنے کی وجہ سے گاہکوں کے چہروں پر چمک دکھاتی دیتی ہے۔ دکانداروں کے چہرے اچھے کاروبار کی وجہ سے چمکتے نظر آتے ہیں۔ اِس بھیڑ بھاڑ میں ایک لڑکا کاندھے پر کپڑے کا تھیلا لٹکائے بازار کی آخری والی ریڈیمیڈ کپڑوں کی چھوٹی سی دکان جو کہ رحمت خان کی تھی پر بلاناغے ہر روز دکان کے سامنے کھڑے ہوکر دکان سے باہر گاہکوں کو للچانے کے لیے لٹکائے گئے بچوں کے کپڑوں کو تکا کرتا تھا اور رحمت خان اس لڑکے کو تکا کرتے تھے۔ تا کا تا کی کا یہ کھیل روز کا معمول بن گیا تھا۔ لڑکے کو اُن کپڑوں کو دیکھنے میں مزہ آتا تھا اور رحمت خان کو اس لڑکے کی نادیدہ نظروں کو دیکھنے میں لطف آتا تھا۔ وہ لڑکا رات نو بجے کے قریب آتا۔ دکان کے سامنے کھڑا ہوتا۔ تقریباً آدھا گھنٹے کھڑے کھڑے کپڑوں کو گھورتا اور چلا جاتا۔

رحمت خان نے لگاتار اس لڑکے کو دیکھ کر اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ غریب ہے۔ ہوسکتا ہے یتیم بھی ہو۔ دیوالی ہے۔ شاید ہندو ہے اس لیے کپڑے خریدنا چاہتا ہوگا لیکن اس کے حالات اس کی غریبی یا اس کی جیب کپڑے خریدنے کی اجازت نہیں دیتے ہوں گے۔ اس لیے وہ کپڑوں کو دیکھ دیکھ کر دل کی حسرت پوری کر لیتا ہوگا۔ بیچارہ! اِس کی بیچارگی کا خیال آتے ہی رحمت خان کا دل پسیج گیا اور انھوں نے لڑکے کو آواز دے کر قریب بلایا۔

”اے لڑکے...! اِدھر آ۔!!“

لڑکا سہما سہما سا رحمت خان کے قریب گیا تو رحمت خان نے شفقت سے پوچھا کیا بات ہے بیٹا!!؟“

”کچھ نہیں چاچا آپ کی دکان میں کپڑے اچھے ہیں، اس لیے دیکھا کرتا ہوں... بس...!!“

”کیا نام ہے بیٹا تمہارا۔!!؟“

”گوپال۔!!“

”کہاں رہتے ہو...!؟“

”شہر کے اُس پار جھگی میں۔!!“

''ماں باپ کیا کرتے ہیں تمھارے!!؟''

''ماں باپ نہیں ہیں چاچا۔ بوڑھی نانی ہے اسی نے مجھے پالا ہے۔ میرے ماں باپ میرے بچپن میں ہی مر گئے تھے!''

''رات بہت ہو چکی ہے بیٹا... گھر جاؤ نانی انتظار کرتی ہوگی!!''

لڑکے نے سعادت مندی سے سر ہلایا اور کچرے کا تھیلا اٹھا کر مایوسی سے قدم اٹھاتے ہوئے چلا گیا۔ لڑکے کو جاتا ہوا دیکھ کر رحمت خان نے سوچا... غریبی اور یتیمی بھی کیا بری بلا ہے۔ اللہ خیر کرے...!! اللہ کی مرضی۔!! شاید اللہ نے زکواۃ ایسے ہی بے سہارا اور یتیموں کے لیے امیر لوگوں پر فرض کی ہے۔ پھر چاہے وہ ہندو ہو یا مسلمان!!! انشاء اللہ کل جب وہ لڑکا آئے گا تو میں ایک قمیض اور نیکر اسے دے دوں گا تاکہ بیچارے یتیم کی دیوالی اچھے سے گزر جائے۔ آخر مجھ پر بھی زکواۃ فرض ہے۔ ضرورت مند کو جب دو تب ثواب پاؤ!! ضروری نہیں ہے کہ زکوٰۃ رمضان میں ہی دی جائے!!

دوسرے روز رحمت خان نے ایک خوبصورت قمیض اور نیکر نکال کر کاؤنٹر کے پاس رکھ دی کہ وہ لڑکا آئے گا تو اسے دے دوں گا۔ نو بجنے والے تھے۔ اس لڑکے کے آنے کا وقت ہو گیا تھا۔ رحمت خان اس لڑکے کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے مگر دور دور تک انھیں وہ نظر نہیں آیا تو وہ پانی پینے کی غرض سے دکان کے پچھلے حصے میں گئے اور پانی پی کر لوٹے تو کیا دیکھتے ہیں کہ وہ لڑکا اس کے لیے نکال کر رکھی قمیض اور نیکر کو اٹھا کر بھاگ رہا ہے... انھوں نے اسے آواز دی... اے رک... اور اس کے پیچھے دوڑنے لگے۔ تھوڑی دور تک دوڑنے کے بعد انھوں نے اسے پکڑ لیا اور چیخ کر بولے۔

''نالائق...! یہ کیا حرکت کی تم نے...!!؟ یہ قمیض اور نیکر میں نے تمھیں تحفے میں دینے کے لیے ہی نکال کر رکھی تھی کیونکہ مجھے تمھاری سادگی اور معصومیت بھا گئی تھی اور کل جب تم نے اپنی یتیمی والی بات مجھے بتائی تھی تو میں نے اسی وقت ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ یہ قمیض اور نیکر تمھیں دیوالی کے لیے تحفے میں دے دوں گا۔ لیکن تم نے آج میرے بھروسے میرے یقین کو چکنا چور کر دیا ہے۔ شاید لوگ غریبوں کو شک کی نظروں سے اسی لیے دیکھتے ہیں کہ وہ تمھاری طرح حرکتیں کرتے ہیں۔ اے کاش... اے کاش... تم نے ایسا نہیں کیا ہوتا۔!! کہہ کر رحمت خان رونے لگے۔ لڑکے کی آنکھوں سے بھی آنسو جاری ہو گئے تھے۔ وہ خوف سے کانپنے لگا تھا۔ روتے روتے اس نے رحمت خان کے پیر پکڑ لیے۔ تماشہ دیکھ کر بھیڑ جمع ہو گئی تھی۔ ایک دو حضرات نے لڑکے کو طمانچہ جمانے کی کوشش کی تو آنسو پوچھتے ہوئے رحمت خان نے خبردار کیا۔

''دیکھو کوئی بھی اس لڑکے کو ہاتھ نہیں لگائے گا سمجھے!!! اس کو سزا دینے سے پہلے اس کے حالات، اس کی کیفیت، اس کی غریبی، اس کی یتیمی کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ سماج کے لیے غریبوں کے لیے یتیموں کے لیے اپنی ذمے داری کو پورا کرو...! اور پھر اِس پر ہاتھ اٹھاؤ۔!! یہ سنتے ہی بھیڑ سر جھکا کر گزر گئی۔

چاچا...!! مجھے معاف کر دو۔! کہتے ہوئے گوپال رحمت خان سے لپٹ گیا۔ رحمت خان نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا... آ بیٹا چل میرے ساتھ چل!! آئندہ ایسی حرکت کبھی مت کرنا کیونکہ اب تو یتیم نہیں ہے بیٹا۔ تیرا یہ چاچا رحمت خان ابھی زندہ ہے۔!!!

■

Raunaq Jamal
'Kainat' Street No.9, New Adarsh Nagar
Durg - 491001 (Chhattishgarh)

سردار ساحل

اقبال کا زمانہ

ہندو ستاں میں اب بھی گونجے ہے یہ ترانہ
''مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا''
خونِ جگر سے جس نے لکھا تھا یہ ترانہ
اک بار یاد کرلیں اقبال کا زمانہ

اردو زباں کو اس نے جی جان سے سنورا
اور صنفِ نظم کو بھی کیا خوب ہے نکھارا
اشعار میں ہے اُس کے اندازِ عاشقانہ
اک بار یاد کرلیں اقبال کا زمانہ

کم عمر ہی میں اس نے دکھلائے اپنے جوہر
کیا کیا نہیں چھپا تھا اس کے قلم کے اندر
سینے میں علم کا تھا اک بیکراں سمندر
اُس کی لیاقتوں پر استاد بھی تھے ششدر
ہر نظم میں نصیحت ہر شعر عارفانہ
اک بار یاد کرلیں اقبال کا زمانہ

قرآں کی ترجمانی اشعار میں روانی
نظموں میں اس نے لکھی ماضی کی ہر کہانی
کس کس طرح گزاری قوموں نے زندگانی
نامِ نبیؐ سے اُس کی ہوتی تھی آنکھ پانی
اقبال مردِمومن اردو کا تھا دیوانہ
اک بار یاد کرلیں اقبال کا زمانہ

ماں باپ خوش تو اُس سے بھائی بھی اُس سے شاداں
استاد داغ اپنے شاگرد پہ تھے نازاں
ارنلڈ اور حسن کا اقبال ہی تھا ارماں
خوشبو سے اپنی جس نے مہکادیا گلستاں
ہرفلسفہ ہے اس کا اخلاق کا خزانہ
اک بار یاد کرلیں اقبال کا زمانہ

معمارِ قوم تھا وہ تدریس کی بدولت
اپنایا اُس نے کچھ دن اور پیشۂ وکالت
دنیا کے شاعروں میں اس کی الگ ہے شہرت
کیا شان اس نے پائی کیا پائی اُس نے عظمت
مقصدہے اپنا ساحل اقبال ڈے منانا
اک بار یاد کرلیں اقبال کا زمانہ

■

انسانیت کو اس نے بخشا نیا کنایہ
برتا ہے اس نے اکثر شاہیں کا استعارہ

Sardar Sahil
9/735 Agadi Street
Kadapa - 516001 (A.P)

محمد خلیل

مکڑی — ایک محنتی ہنرمند کیڑا

مکڑی کے نام سے تو ہم سب ہی اچھی طرح واقف ہیں۔ لیکن مکڑی کی عادتوں، طور طریقے اور اس کی ہنرمندی سے ہماری واقفیت بہت کم ہے۔ مکڑی ایک چھوٹا سا کیڑا ہے۔ ہمارے گھروں کے کونوں میں، پیڑ پودوں پر، لکڑیوں کے درمیان، یہاں تک کہ جنگل، ریگستان میں بھی مختلف قسموں کی مکڑیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ ساری دنیا میں پائی جاتی ہیں اوراس کی تقریباً چالیس ہزار قسمیں ہیں۔

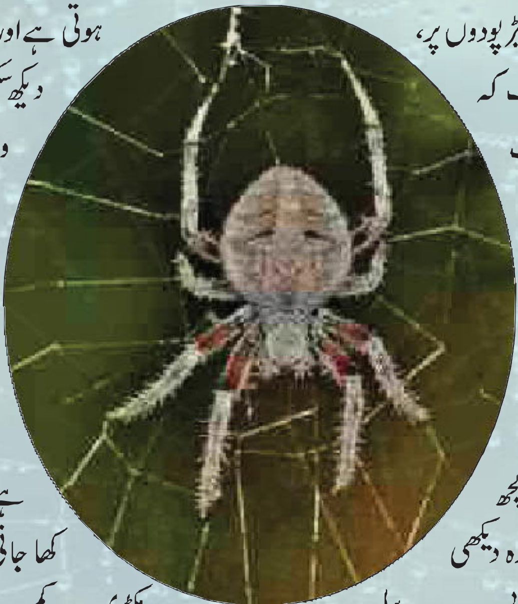

عام طور پر مکڑی کا دورِ زندگی ایک سال ہوتا ہے۔ لیکن کچھ مکڑیاں پندرہ سال تک بھی زندہ دیکھی گئی ہیں ۔ یہ مکڑیاں سرخ، گلابی، ہرے، پیلے، کالے اور بھورے رنگوں میں پائی جاتی ہیں۔ ان کے جسم کی بناوٹ ایک جیسی نہیں ہوتی کیونکہ کچھ تو بے حد چھوٹی ہوتی ہیں جنھیں آپ کا آنکھوں سے بخوبی دیکھنا مشکل ہے لیکن اس کے برخلاف ان کی کچھ قسمیں دو انچ سے بھی بڑی ہوتی ہیں۔

مکڑی دیکھنے میں کافی حد تک کیڑوں سے ملتی جلتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ کیڑوں سے کوئی زیادہ مناسبت نہیں رکھتی۔ اس کی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ اس میں کیڑوں کی طرح چھ ٹانگیں نہیں پائی جاتیں بلکہ مکڑی میں آٹھ ٹانگیں موجود ہوتی ہیں جو انھیں گرنے سے بچاتی ہیں۔ کیکڑوں کی طرح اس کا جسم تین حصوں میں تقسیم نہیں ہوتا بلکہ صرف دو حصوں میں ہوتا ہے۔ اسی طرح کیڑوں کے برخلاف مکڑیوں کے آٹھ آنکھیں ہوتی ہیں۔ زیادہ آنکھوں کے باوجود ان کی نگاہ کمزور ہوتی ہے اور یہ 30 سینٹی میٹر کی دوری تک ہی دیکھ سکتی ہیں اور ہر مکڑی میں جالا بنانے والے کم از کم دو غدّے بھی پائے جاتے ہیں۔

مکڑا چھوٹا ہوتا ہے۔ جبکہ مکڑی کے جسم کی بناوٹ بڑی ہوتی ہے۔ مکڑی کو خوش کرنے کے لیے کئی بار مکڑے کو گھنٹوں ناچنا پڑتا ہے۔ اکثر ملنے کے بعد مکڑی مکڑے کو کھا جاتی ہے۔ یوں بھی مکڑے کی زندگی مکڑی سے کم ہوتی ہے۔ کچھ مکڑیاں ہزاروں کی تعداد میں انڈے دیتی ہیں لیکن انڈے سے باہر آتے ہی بچے اپنے بھائی بہنوں کو ہی کھا جاتے ہیں۔

مکڑی کو قدرت نے اپنی بہترین نعمتیں عطا کی ہیں جس میں اس کا جالا بننا سب سے زیادہ تعجب والی چیز ہے۔ جالا بننے میں سبھی مکڑیاں ماہر ہوتی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ یہی جالا مکڑی کی حفاظت کرتا ہے۔ یہی جالا مکڑی کا گھر ہے اور اسی کی مدد سے وہ اپنا شکار پکڑتی ہے اور اس کے جالے اس طرح کے ہوتے ہیں جو کیڑوں کو روکنے کا کام انجام دیتے ہیں۔ اس جالے میں دھاگے دو قسم کے ہوتے ہیں ایک ایسے ہوتے ہیں جس میں

لیس دار مادّہ پایا جاتا ہے جس سے کیڑے اس میں چپک کر پھنس جاتے ہیں جبکہ دوسرے دھاگے میں لیس دار مادّہ نہیں ہوتا۔ یہ دھاگا ریشم کی طرح ملائم، نرم لیکن بہت مضبوط ہوتا ہے۔ جالا بنانے کے لیے مکڑی کے جسم میں خاص طرح کے غدود (گلینڈز) پائے جاتے ہیں۔ یہ غدود، مکڑی کے بدن میں کافی تعداد میں ہوتے ہیں اور کبھی کبھی تو ان کی تعداد کئی سو تک پہنچ جاتی ہے۔ مکڑی کے جالے کا ایک دھاگا اس قدر باریک ہوتا ہے کہ آپ آنکھ سے بہ مشکل دیکھ سکتے ہیں اور کئی دھاگے اس قدر مضبوط ہوتے ہیں کہ کوئی کیڑا انھیں توڑ کر نکلنے کی ہمت نہیں کرسکتا۔ یہاں تک کہ جالے میں کبھی کبھی ٹڈّے، بھی

پھنس کر نہیں نکل پاتے۔

اب جالا بنانے کے بارے میں بھی سن لیجیے۔ جب کوئی بھی مکڑی جالا بنانا شروع کرتی ہے تو سب سے پہلے ایک دھاگے کو کمرے کی کسی دیوار کے دو کناروں پر جوڑتی ہے اور اسے مضبوط بناتی ہے۔ اس کے بعد دھاگے سے جالے کا فریم بناتی ہے جب یہ تیار ہوجاتا ہے تو مکڑی ان دھاگوں کو ان تاروں سے جوڑتی رہتی ہے۔ یہ سائیکل کے پہیے کی طرح چاروں طرف بنائے جاتے ہیں۔ یہ تار بھی جالوں کے دھاگوں سے بنے ہوتے ہیں۔ اس طرح مکڑی کا جالا تیار ہوجاتا ہے۔ جس کے بیچ میں ایسی جگہ ہوتی ہے جہاں مکڑی خطرے کے وقت اپنے دشمن سے بچ سکتی ہے۔ کسی طرح اگر اس جالے کو بھی نقصان پہنچ جائے یا کسی طرح ٹوٹ جائے تو مکڑی دوبارہ اس جگہ پھر جالا بنا لیتی ہے۔ مکڑیاں جالے بھی عجیب وغریب قسم کے بناتی ہیں۔ گھاس میں پائی جانے والی مکڑی ایسا جالا بناتی ہے جس میں ایک پچھلا دروازہ بھی ہوتا ہے۔ خطرہ پیدا ہونے پر اس کے ذریعے مکڑی نکل بھاگتی ہے۔ جالا بنانے میں مکڑی اس کا خیال رکھتی ہے کہ جالا ایسا ہو کہ اس کا شکار بھاگ نہ سکے۔

اگر آپ غور کریں تو گھریلو مکڑیوں کے جالے کو خود دیکھ سکتے ہیں کس طرح یہ غیر ترتیبی سے بنے ہوتے ہیں۔ اس میں مکڑی اور اس کے بچے بھی اکثر لٹکے ہوتے ہیں اور مکڑی اپنے شکار کو جو جالے میں آپھنستا ہے۔ قابو میں کرنے کے لیے مختلف طریقے اپناتی ہے۔ کچھ تو جالے میں دشمنوں کو مائل کرنے کے لیے خاص قسم کی غذا باندھ دیتی ہیں۔ باندھنے والے پھندوں کے دھاگے عام دھاگوں سے مضبوط ہوتے ہیں لیکن اگر کسی طرح دشمنوں کو روکنے میں جالے کے یہ پھندے ناکام ہورہے ہوں تو اس وقت مکڑی فوراً ایک خاص طرح کا زہر اپنے جسم سے نکالتی ہے اور اسے اپنے ڈنک کے

ذریعے شکار کے جسم میں داخل کرتی ہے۔ یہ زہر شکار کے بھاگنے یا بچنے کی آخری کوشش کو بھی ناکام بنا دیتا ہے اور پھر شکار کو مکڑی ہضم کر جاتی ہے۔ جالے مکڑی کے سفر کرنے میں بھی مددگار ہیں کیونکہ سفر کرتے وقت مکڑی ایک دھاگا بنتی رہتی ہے تاکہ اگر وہ کسی وجہ سے گرے تو زمین سے نہ ٹکرائے بلکہ دھاگے کی وجہ سے بیچ میں ہی لٹکی رہے۔ دیکھا آپ نے مکڑی کے جالوں کا کمال۔

اگر آپ غور کریں تو گھریلو مکڑیوں کے جالے کو خود دیکھ سکتے ہیں کس طرح یہ غیر ترتیبی سے بنے ہوتے ہیں اس میں مکڑی اور اس کے بچے بھی اکثر لٹکے ہوتے ہیں اور مکڑی اپنے شکار کو جو جالے میں آ پھنستا ہے۔ قابو میں کرنے کے لیے مختلف طریقے اپناتی ہے۔ کچھ تو جالے میں دشمنوں کو مائل کرنے کے لیے خاص قسم کی غذا باندھ دیتی ہیں باندھنے والے پھندوں کے دھاگے عام دھاگوں سے مضبوط ہوتے ہیں لیکن اگر کسی طرح دشمنوں کو روکنے میں جالے کے یہ پھندے ناکام ہو رہے ہوں تو اس وقت مکڑی فوراً ایک خاص طرح کا زہر اپنے جسم سے نکالتی ہے اور اسے اپنے ڈنک کے ذریعے شکار کے جسم میں داخل کرتی ہے۔ یہ زہر شکار کے بھاگنے یا بچنے کی آخری کوشش کو بھی ناکام بنا دیتا ہے اور پھر شکار کو مکڑی ہضم کر جاتی ہے۔ جالے مکڑی کے سفر کرنے میں بھی مددگار ہیں کیونکہ سفر کرتے وقت مکڑی ایک دھاگا بنتی رہتی ہے تاکہ اگر وہ کسی وجہ سے گرے تو زمین سے نہ ٹکرائے بلکہ دھاگے کی وجہ سے بیچ میں ہی لٹکی رہے۔ دیکھا آپ نے مکڑی کے جالوں کا کمال۔

■

ماخذ: حیوانات کی دلچسپ دنیا، **مصنف:** محمد خلیل، **ناشر:** قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

Subscription Form "Bachon Ki Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں بچوں کی دنیا' کا/کی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر.................................... بتاریخ...

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/100 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: SYNB0009009

میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'بچوں کی دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون:011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.: sales@ncpul.in

دستخط

بانو سرتاج

رنگ نرالے سرکس کے

سرکس لفظ کی تخلیق لاطینی زبان کے لفظ سرکل (Circle) بمعنی 'دائرہ' سے ہوئی ہے۔ انگریزی زبان میں سرکل کو رِنگ (Ring) کہا جاتا ہے۔ رنگ یعنی کھیلنے کا گول میدان۔

رِنگ میں کھیل دکھانے والے کو 'رِنگ ماسٹر' کہا جاتا ہے۔

سرکس میں ایک گول میدان میں تمام کرتب دکھائے جاتے ہیں۔ بین الاقوامی پیمانے کے مطابق اس میدان کا پھیلاؤ 13 میٹر ہونا چاہیے۔

1768 کی بات ہے گھڑسواری کے ماہر انگلینڈ کے سارجنٹ میجر فلپ ایشلے (Philp Ashlay) نے محسوس کیا کہ اگر وہ گھوڑے کی پشت پر کھڑے ہوکر گول میدان کا چکر لگائے تو عین المرکز کشش (Centrifugal Force) اُسے بیلنس قائم کرنے میں سہارا دے گی۔ اس کرتب کی مشق کے لیے اس نے جو میدان تیار کیا، وہی سرکس کا اوّل میدان یا رِنگ مانا جاتا ہے۔

کرتب دکھانے اور دیکھنے کی روایت دنیا میں زمانۂ قدیم سے چلی آ رہی ہے۔ بہروپیے، نٹ، قلا باز، رقاص، گلوکار... بازاروں، چوراہوں، شادی اور خوشی کی دیگر محفلوں، تہواروں وغیرہ کے موقعوں پر گھوم گھوم کر اپنے فن کا مظاہرہ کرتے جہاں بھیڑ جمع ہونے کا امکان ہوتا وہاں وہ کرتب دکھاتے اور دیکھنے والے خوش ہوکر انھیں انعام دیتے۔

سرکس کی ابتدائی شکل وہ کھیل مانا جاتا ہے جو ملک روم کے ایک اسٹیڈیم میں دکھایا جاتا تھا۔ جولیس (Julius Ceasor) کے زمانے کا یہ اسٹیڈیم یا الفی تھیٹر، بہت بڑا تھا۔ اس میں ڈیڑھ لاکھ لوگ ایک ساتھ بیٹھ سکتے تھے۔ کھیل صرف ایک ہوتا تھا وہ بھی نہایت خطرناک۔ ایک غلام کے ہاتھ میں ہتھیار دے کر اسے 'بھوکے شیر کے سامنے چھوڑ دیا جاتا تھا۔ اس کھیل کے آخر میں دونوں میں سے کوئی ایک اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا۔ آہستہ آہستہ عوام کی اس کھیل میں دلچسپی کم ہوگئی۔ (اٹھارویں صدی میں اس خطرناک اور غیر انسانی کھیل پر پابندی بھی لگا دی گئی۔)

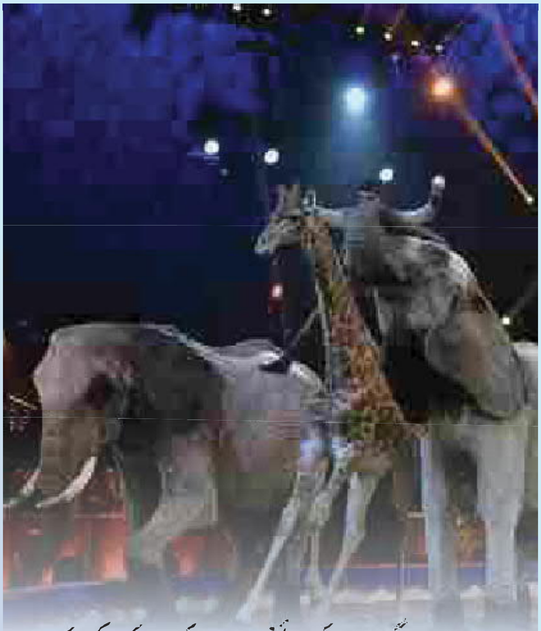

روم میں گھوڑوں کی نمائش اور ان کی دوڑ کو سرکس کہا جاتا تھا۔ ایک بڑا گول دائرہ بنا کر تین طرف لوگوں کے بیٹھنے کا انتظام کیا جاتا۔ درمیان میں گھوڑوں کی دوڑ ہوتی۔ سرکس میکسیمم (Circus Maximum) کو اس طرح کا پہلا سرکس ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔

ملک روم کے زوال کے بعد سرکس پھر شروع ہوا۔ چودھویں صدی میں انگلینڈ میں جپسیوں نے اس کا آغاز کیا۔ ماڈرن سرکس کا جنم داتا فلپ ایشلے کو مانا جاتا ہے۔ وہ دوڑتے ہوئے گھوڑے پر بیلنس کے مختلف کرتب دکھاتا تھا۔ اس نے پیسہ پیسہ جوڑ کر زمین خریدی اور رنگ بنا کر کمال دکھانے لگا۔ نام رکھا، رائل گروو (Royal Grove)، رائل گروو (Royal Crove Circus) کا پہلا شو 9 جنوری 1768 کو لندن میں پیش کیا گیا۔ اسی شو میں ایشلے نے پہلی مرتبہ جوکروں کو شائقین سے متعارف کرایا۔ ہندی کی ایک شاعرہ 'سدھا انوپم' نے ایشلے اور سرکس کے آغاز کی کہانی ایک نظم میں بڑی خوبصورت اور تفصیل کے ساتھ بیان کی ہے:

سینا کا ایک سارجنٹ	فلپ ایشلے نام
سن سترہ سو انہتر میں	ڈھونڈ رہا تھا کام
گھٹنا1 ہے یہ لندن کے برج	ویسٹ منسٹر تیرے 2 کی
فلپ کو اچانک مل گئی	انگوٹھی ایک ہیرے کی
انگوٹھی کو بیچ کے اس نے	ایک خریدا گھوڑا
گھڑسوار تھا، انو بھو3 پہلا	کام آ گیا تھوڑا
قلابازیاں دکھلاتا وہ	لوگ پھینکتے پیسہ
آمدنی بھی ہوئی ساتھ میں	کام ہو گیا ایسا
دھیرے دھیرے ہنر کا اپنی	لینے لگا وہ فیس
ٹکٹ خریدیں، شو کو دیکھیں	جن کے دل میں ٹیس
ایک ڈرم4 کو لے کر اس نے	کیا آواز کا کھیل
وائس 5 افیکٹ سے بڑھ گئی	شو ٹکٹوں کی سیل 6
خیال نیا کرنے کا آیا	اس کے ذہن سے ہوکر
مسخری پیدا کرنے کو وہ	لے آیا دو جوکر
دھیرے دھیرے شو کو اس کے	ملنے لگ گیا نام
ہولے ہولے طرح طرح کے	شو میں جڑ گئے کام
ایشلے کے سرکس میں کل	انئیس طرح کے کرتب
پورے یوروپ میں گھوما وہ	جیسے سرکس گھومے اب
ایشلے جی نے طے کیا تھا	رنگ کا جو آکار 7
اب بھی اسی روپ میں ملتا	سرکس کا سنسار

اس دوران ایشلے کے بہت سے شاگرد بن گئے۔ وہ انھیں گھڑسواری کے کرتبوں کی ٹریننگ دینے لگا۔ 1782 میں اس کے ایک شاگرد چارلس ہیوز (Charles Hues) نے اپنا

(1) واقعہ، (2) کنارے، (3) تجربہ، (4) ڈرم بجانے والا، (5) موسیقی کا جادو، (6) Sqle، (7) ناپ

الگ سرکس 'رائل سرکس' قائم کیا۔ چارلس ہی نے سب سے پہلے 'سرکس' لفظ کا استعمال کیا۔ اس سرکس نے بے پناہ مقبولیت حاصل کی۔ فرانس کے راجہ نے انہی دنوں فلپ ایشلے کی شہرت سن کر اسے فرانس آنے کی دعوت دی جسے ایشلے نے قبول کیا اور فرانس میں سرکس کا آغاز ہوگیا۔ روس سے چارلس ہیوز کو بلاوا آیا اور روس میں سرکس دکھایا جانے لگا۔ لینن کی حوصلہ افزائی سے ماسکو میں 'سرکس اسکول' قائم کیا گیا۔ آج دنیا بھر میں سب سے زیادہ مقبول روس ہی کے سرکس ہیں۔ انگلینڈ کے جان بل ریکٹس (John Bill Rikats) نے امریکہ میں 13/اپریل 1793ء کو فلاڈلفیا میں سرکس کمپنی قائم کی اور امریکیوں نے پہلی مرتبہ سرکس کا لطف اٹھایا۔ جانوروں کے کرتب سب سے پہلے امریکہ کے سرکس میں دکھائے گئے۔ آئی۔ اے۔ وین۔ آمبرگ نیویارک کے چڑیا گھر میں جانوروں کی دیکھ بھال پر معمور تھا۔ جانور اس سے مانوس تھے۔ اس نے ہی سب سے پہلے جانوروں کے کرتب دکھائے۔ شیر کے منہ میں سر رکھنے کا کرتب اسی نے شروع کیا تھا۔

بھارت میں سرکس کا آغاز 1880 سے ہوا۔

1879 میں ممبئی کے وکٹوریہ ٹرمینس (Victoria Terminus) جو آج چھترپتی شیواج ٹرمینس (CST) کہلاتا ہے) میں ایک سرکس 'اٹالین سرکس' لگا۔ اس کا مالک ولیم شائنی تھا۔ ولیم شائنی، سرکس میں گھوڑے کے کرتب دکھاتا۔ وہ دوڑتے ہوئے گھوڑے پر سوار ہوتا اور کبھی ایک پاؤں پر، کبھی دو پاؤں پر کھڑا ہو جاتا، کبھی تو سر کے بل کھڑا ہو جاتا۔ وہ نہایت مشاقی سے دو گھوڑوں کی سواری کا کرتب بھی دکھلاتا۔ شائقین حیرت زدہ اس کے کرتب دیکھتے۔ خوش ہو کر تالیاں بجاتے۔ ولیم کا حوصلہ بڑھ جاتا۔ ایک روز ترنگ میں آ کر نہایت ہی ذلت آمیز لہجے میں اس نے اعلان کیا کہ ''جیسے کرتب میں دکھلاتا ہوں اگر ویسے کرتب کوئی ہندوستانی کر کے دکھاوے تو میں اسے 1001 روپے اور ایک قیمتی گھوڑا انعام میں دوں گا۔''

کرنداباد (Kurandabad) یا کورٹووڑی، کولہا پور، مہاراشٹر کے راجہ کے اصطبل کے ایک سائیس وشنو پنت ونائک چھترے، جو شہزادوں کے گھڑسواری کے استاد بھی تھے، وہاں موجود تھے۔ ان سے یہ ذلت برداشت نہ ہوئی۔ اپنی جگہ سے کود کر رِنگ میں پہنچے اور پل بھر میں ولیم شائنی کو گھوڑے سے گرا کر خود گھوڑے پر سوار ہوگئے۔ یکے بعد دیگرے وہی کمال دکھانے لگے جو ولیم دکھاتا تھا۔

سارا خیمہ تالیوں کے شور سے گونج اٹھا۔ وشنو پنت چھترے نے رک کر گھوڑے کی باگ ولیم کے ہاتھ میں تھمائی تو اس نے فراخ دلی سے ان کی تعریف کی۔ انعام کی رقم ادا کر کے ایک عمدہ گھوڑا ان کے حوالے کر دیا۔

بات وشنو پنت چھترے کے دل کو لگ چکی تھی۔ ولیم سیک گفتگو کے دوران انھیں یہ بھی سننا پڑا تھا کہ ''بھارت میں سرکس کا آغاز ابھی ممکن نہیں۔ کافی عرصہ لگے گا اس کے لیے۔'' انھوں نے تن من دھن سے اس سمت میں کام شروع کیا اور 1880 میں اپنی بیوی کے ساتھ مل کر Chatre's Great Indian Circus شروع کر دیا۔ ابتدا میں اس سرکس میں صرف جانوروں کے کرتب دکھلائے جاتے تھے کیونکہ سرکس میں کام کرنے کے لیے انھیں انسانی کلاکار ملے ہی نہیں۔ اُس کے بعد نیو انڈیا سرکس The new India Circus اور تارابائی سرکس قائم ہوئے۔

کیرالہ کے کِلاری وُلٹّی کُنّی کنن (Kilari Wulatti Kunni-Kanan) بھارتیہ مارشل آرٹ 'کلاری کائٹو'

(Indian Martial Art kalari Kaitu) میں ماہر تھے۔
کنی کنن نے وشنو پنت چھترے کے لیے کلاکار مہیا کرنے کی غرض سے کولم کے ایک گاؤں چرا کرا (Chirakkara) میں ٹریننگ اسکول قائم کیا۔

کنی کنن کے سرکس کا نام تھا اورینٹ سرکس (Orient Circus)۔ 1920 میں گریٹ بامبے سرکس (Great Bombay Circus) کی بنیاد بابوراؤ کدم نے رکھی۔ 1940 میں 'نیوانڈیا سرکس' اور 'اورینٹ سرکس'، 'گریٹ بامبے سرکس' کا حصہ بن گئے اور گریٹ بامبے سرکس، نئی آن بان اور شان کے ساتھ عوام کو تفریح مہیا کرانے لگا۔ ایک وقت تھا جب بھارت میں 460 سرکس کمپنیاں کام کرتی تھیں۔ ہندوستان کے مشہور سرکس کے نام اس طرح ہیں: گریٹ رائل سرکس (1909)، ریمنڈ سرکس (1925)، امر سرکس (1951)، راج کمل سرکس (1958)، جمبو سرکس (1977)، ریمو سرکس (1991)۔ 1925 کا قائم شدہ ریمنڈ سرکس بھارت کا سب سے بڑا سرکس مانا جاتا ہے۔

جوکر کا سرکس میں اہم رول ہوتا ہے۔ دو کرتبوں کے درمیانی وقفے میں جوکر رنگ میں آکر جو اچھل کود مچاتے ہیں، مزاحیہ حرکتیں کرتے ہیں وہ بچوں کو بہت زیادہ پسند آتی ہیں۔ جوکر کا قد کاٹھی، ان کا لباس، ان کی ٹوپی، ان کی مصنوعی ناک، بھی بچوں کو دلکش لگتی ہے۔ سرکس کی تاریخ میں چند جوکر ایسے ہیں جن کے نام کافی مشہور ہیں۔ روس کے جوکر، اولوگ پوپوئے (Olog Popoi) نے نہ صرف روس میں بلکہ امریکہ میں بھی دھوم مچائی۔ بونے جوکر جنرل ٹام تھمب (Tom Thumb) نے اپنے وقت میں بڑا نام کمایا۔ ابراہیم لنکن، مہارانی وکٹوریہ، مہارانی ازابیلا، ڈیوک آف ونگٹن نے بھی اس کی تعریف کی تھی۔

ٹام نے سرکس میں کام کرنے والی بونی لیوینیا ویرل (Levenia Vairal) سے شادی کی۔ صرف 21 کی بونی خاتون لیوگراف (Leograph) نے بھی کافی عرصے سرکس میں کام کیا۔
سرکس کے عجوبوں میں 13½ لمبی داڑھی والی خاتون

لیڈی اولسا(Lady Olsa) کو دیکھنے کے لیے لوگ کئی کئی مرتبہ سرکس دیکھتے تھے۔ اس کے نام پر ٹکٹ فروخت ہوتے تھے۔ 65 برس کی عمر تک اس نے سرکس میں کام کیا۔ اولسا 1871 میں کیرولیا میں پیدا ہوئی تھیں۔ اس نے رنگ لنگ بردرس سرکس(Ringling Brother's Circus)، برنم بردرس سرکس Burnum Brother's Circus اور رائل امریکن شو میں کام کیا۔

فرینک لیٹنی(Frank Latini) 1883 میں سسلی کے ایک قصبے میں پیدا ہوا۔ فرینک کی تین ٹانگیں تھیں۔ تیسری ٹانگ کو وہ اسٹول کی طرح بیٹھنے کے لیے استعمال کرتا، اس سے فٹ بال بھی کھیلتا۔ لوگ اسے دیکھنے اُمڈ پڑتے تھے۔

جیک اکرٹ (Jack Ikart) 'گوشت کا پہاڑ' کہلاتا تھا۔ اس کا وزن 335.20 کلوگرام تھا اور کمر 187 چوڑی تھی۔ اس کا لٹکا ہوا پیٹ دیکھ کر بچے بہت ہنستے تھے۔ وہ برمن اینڈ بیلا (Burman and bela) سرکس میں کام کرتا تھا۔

بے بی رُتھ (Baby Ruth) 1804 میں انڈیانا (امریکہ) میں پیدا ہوئی تھی۔ اس کا وزن 366.68 کلوگرام تھا۔ وہ رِنگ لِنگ سرکس کی کلاکار تھی۔

سرکس میں مقبولیت کے ریکارڈ کو دیکھا جائے تو روس کے سرکس تمام دنیا میں سب سے زیادہ مقبول ہیں۔ اس کے بعد یوگوسلاویہ، اٹلی، چیکوسلواکیہ، امریکہ کا نمبر آتا ہے... کرتبوں میں، قلابازی میں مشرقی یوروپ، نٹ کرتب میں ایشیا، بغیر کاٹھی کے گھوڑوں کے کرتبوں میں انگلینڈ، اور جانوروں کے کرتبوں میں امریکہ زیادہ مشہور اور زیادہ مقبول ہے۔

سرکس میں کام کرنے والا سب سے پرانا خاندان، جرمنی کے قلاباز جان ایور ہارڈ (John Ever Hard) کا خاندان ہے۔ جنوری 1907 میں جان کی وفات کے بعد سے ان کی اولاد آج تک سرکس میں کام کر رہی ہے۔

جانوروں کو کرتبوں کی ٹریننگ دینے والا سب سے پہلا شخص وین آمبرس (Van Aambars) ہے۔ جانور (خصوصاً) شری کے پنجرے میں گھسنا، شیر کے منہ میں سر رکھنا اس کے مشہور کرتب ہیں۔

بھارتیہ سرکس کے دو کلاکاروں نے کافی نام کمایا۔ بنگال کے شیامل کانت بنرجی نے گھر سے بھاگ کر سرکس کی ملازمت حاصل کی تھی۔ وہ خالی ہاتھ شیر کے پنجرے میں داخل ہوتے اور کھیل دکھاتے۔ مہندر ناتھ مجومدار 20 من وزنی پتھر کو اپنے سینے پر رکھتے، اسے ہاتھ میں لے کر لاٹھی کی طرح گھماتے، ہاتھی کو اپنے سینے پر سے گزارتے۔

امریکی سرکس کمپنی رِنگ لِنگ برادرس اور برنم اینڈ بیلی سرکس Ringling Brothers and Barnum and Balley Circus دنیا کے سب سے بڑے سرکس مانے

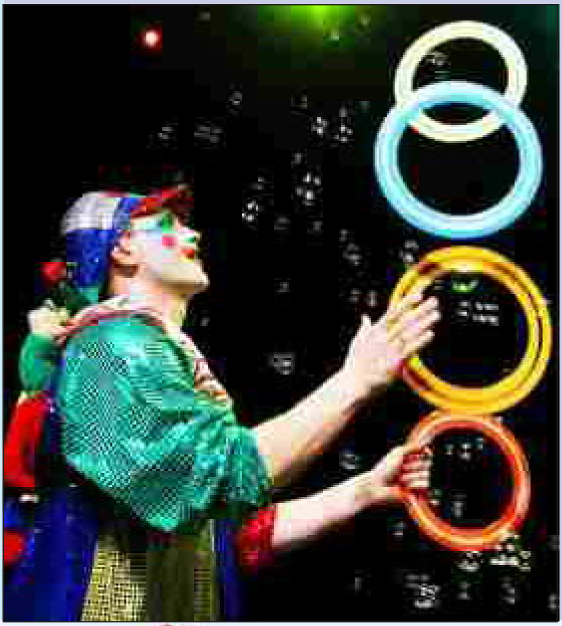

جاتے ہیں۔

1860 تک برنم اور بیلی سرکس الگ الگ چل رہے تھے۔ دونوں کافی مقبول تھے۔ 1880 میں پانچ رِنگ لنگ بھائیوں نے مل کر 'رنگ لنگ سرکس' قائم کیا۔

1907 میں انھوں نے بارنم اور بیلی سرکس کو خرید لیا۔ پہلے یہ تینوں الگ الگ حصوں میں چلتے تھے۔ 1919 میں انھیں ملا کر ایک 'رنگ لنگ سرکس' بنا دیا گیا..... اور پھر یہ سرکس اتنا بڑا بن گیا کہ اسے چلانے کے لیے شہروں میں اسٹیڈیم کرائے پر لینا پڑتا ہے۔ اس سرکس میں اور سبھی سرکسوں سے جانوروں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ صرف ہاتھی ہی اس میں 110 ہیں۔ ایک ساتھ امریکہ کے ایسٹ کوسٹ اور ویسٹ کورٹ میں اس کے شو چلتے ہیں۔

سرکس کے کلاکاروں کی زندگی بھی عجیب زندگی ہوتی ہے۔ کبھی کبھی تو چند کلاکار ساری عمر سرکس میں گزار دیتے ہیں۔ اپنے بچوں کو بھی اسی پیشے میں لگا دیتے ہیں ایک ساتھ کئی کئی نسلیں ایک سرکس میں کام کرتی ہیں۔ نئے زمانے میں ضرور سرکس کلاکار اپنے بچوں کو سرکس کے ماحول سے دور رکھ رہے ہیں۔ اس کے علاوہ اکثر ملکوں میں (بھارت میں کیرالہ، نیپال) غریب لوگ اپنے بچوں کو سرکس والوں کو سونپ دیتے ہیں۔

بال مزدوری قاعدہ(Child Labour Act) کے لاگو ہونے سے سرکس میں بچوں سے کام لینا بند ہوگیا ہے جبکہ چاہے انسان ہو یا جانور، دونوں کے بچوں کو کم عمری سے کرتب سکھانے پڑتے ہیں۔ جب ان کی ہڈیاں لچکیلی ہوں مگر اس قاعدہ کی وجہ سے سرکس کی مقبولیت کافی کم ہوگئی ہے۔

اکثر ایک ملک کے سرکس مالک دوسری سرکس کے کلاکاروں کو اپنے سرکس میں کام کرنے کے لیے بلاتے ہیں اور وہ سال دو سال کے لیے کنٹریکٹ پر آنا منظور کرتے ہیں۔ ان میں ملکی اور غیر ملکی دونوں طرح کے فنکار ہوتے ہیں۔ غیر ملکی فنکاروں سے شو کی کامیابی اور شہرت میں اضافہ ہوجاتا ہے۔

سرکس کا مالک سرکس کے کلاکاروں کے سکھ دکھ کا ساتھی ہوتا ہے۔ وہ ان کے خاندان کا خیال رکھتا ہے۔ ان کے بچوں کی پڑھائی کا انتظام کرتا ہے۔

ریٹائرڈ کلاکار نئے لوگوں کو ٹریننگ دینے کا کام کرتے ہیں۔

سرکس میں کئی لوگ شامل ہوتے ہیں۔ ان میں انسان بھی ہوتے ہیں اور جانور بھی۔ بڑے مشہور نامور کلاکار ہوتے ہیں تو چھوٹی چھوٹی کلاکاری دکھانے والے بھی، مگر یہ سب مل کر ایک خاندان کی تشکیل کرتے ہیں۔ سرکس لگانے کے لیے محکمۂ جنگلات، محکمۂ انسانی فروغ وسائل، کلچرل وزارت وغیرہ سے اجازت حاصل کرنی پڑتی ہے۔ پھر جس شہر میں کھیل دکھانا ہوتا ہے وہاں سب سے پہلے ضلع کلکٹر سے اجازت لینی پڑتی ہے۔ میدان حاصل کرنے کے لیے میونسپلٹی سے تو حفاظتی اقدامات کے لیے محکمہ پولس سے رجوع ہونا پڑتا ہے۔ سرکس کے سبب ہجوم بڑھ جانے سے ٹریفک پولس اور حادثوں کو ٹالنے اور قابو میں کرنے کے لیے فائر بریگیڈ کی مدد لینی پڑتی ہے۔ محکمۂ صحت کی بھی منظوری لینی پڑتی ہے۔ اس طرح کافی مشکلات کے بعد زمین تیار ہوتی ہے۔ خیمہ کھڑا ہوتا ہے اور سرکس شہر میں آتا ہے، بچوں کا دل بہلاتا ہے۔

■

Dr. Bano Sartaj
Opposite Akashwani, Civil Lines
Chandrapur - 442401 (Maharashtra)

مہدی پرتاپ گڑھی

مکڑی کا جالا

آلا بالا مکڑی کا جالا
گھات میں مکڑی، مکڑا کالا
لو جالے میں پھنس گئی مکھی
فوراً دوڑ کے پہنچی مکڑی
اُس کو مضبوطی سے جکڑا
خوب اُسے جالے میں لپیٹا
ہاتھ پاؤں مکھی نے چلائے
لیکن اس کے کام نہ آئے
جاں ہاری بیچاری مکھی
کھاگئے اس کو مکڑا مکڑی
دیکھ کے سارا گڑبڑ جھالا
ہوئی اُداس معصوم غزالہ
قدرت کا دستور ہے اپنا
ایک کے گوشت پر دوسرا پلتا
جنگل میں شیروں کو دیکھو
ہرن بنے ہیں ان کا نوالہ
جتنے بھی ہیں کیڑے مکوڑے
ایک دوسرے کا ہیں نوالہ
اسی طرح دنیا چلتی ہے
حیراں کیوں ہوتی ہو غزالہ

■

Mehdi Partapgarhi
28, School Ward
Partapgarh - 230001 (UP)

فراق جلال پوری

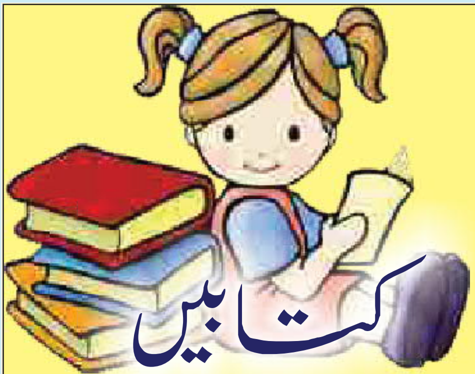

کتابیں

انسان آدمی کو بناتی ہیں کتابیں
آداب زندگی کے سکھاتی ہیں کتابیں
دیتی ہی نہیں درس کبھی جھوٹے عمل کا
سچائی کا ہی پاٹھ پڑھاتی ہیں کتابیں
ذہنوں کو سکھاتی ہیں تمیز اچھے بُروں کی
بینائی نگاہوں کی بڑھاتی ہیں کتابیں
پڑھئے تو مہکتے ہوئے الفاظِ دل آویز
خوشبو کی طرح سانسوں میں آتی ہیں کتابیں
کاغذ پر جواں ہوتا ہے خوشبوؤں کا میلا
ذہنوں میں عجب پھول کھلاتی ہیں کتابیں
بھٹکو نہ اندھیروں میں اجالوں کی طرف آؤ
پاس اپنے محبت سے بلاتی ہیں کتابیں
آنکھوں کو عطا کرتی ہیں خوش رنگ نظارے
بے رنگ خیالوں کو سجاتی ہیں کتابیں
جچتا ہی نہیں ساتھی کوئی اس کو فراق اور
جس شخص سے یارانہ بڑھاتی ہیں کتابیں

■

Firaq Jalalpuri
Mohalla: Qazipura , Post: Jalalpur
Distt: Ambedkar Nagar - 224149 (UP)

محمد رفیع انصاری

سیلاب

ہے کرۂ زمیں پر پانی کی حکمرانی
آؤ سنائیں تم کو سیلاب کی کہانی

سیلاب اصل میں ہے پانی کا ایسا دھارا
جس کو نہ جھیل پائے دریاؤں کا کنارا

ہو برف کا پگھلنا، یا، ہو جوار بھاٹا
طغیانیوں سے ان کا قائم رہا ہے ناتا

ابرِ کرم ہے ویسے قدرت کی اِک نوازش
سیلاب کی مصیبت لاتی ہے تیز بارش

اُٹھتا ہے ندّیوں سے پانی کا ایسا ریلا
چٹّان ٹوٹ جائے پانی کا جیسے ڈھیلا

آتے ہیں اس کی زد میں انسان اور حیواں
آبادیاں، ٹھکانے، محلات اور ایواں

کیا کھیت اور کھلیاں، کیا پیڑ اور پودے
سب کو لگائے ظالم یہ پے بہ پے کچوکے

اب تک نہیں ملی ہے اس سے چمن کو راحت
یہ ملک کے لیے ہے اِک ناگہانی آفت

سیلاب کی خبر سے ہوتے ہیں سب ہی بیکل
اس مسئلے کا لیکن اب چاہیے کوئی حل

رہنے لگی ہیں نہریں ہم سے خفا خفا سی
ہوتی نہیں ہے بہتر پانی کی اب نکاسی

گہری ہر اِک ندی ہو، دریا پہ بھی ہوں پہرے
تا کہ حدوں میں ان کی پانی مدام ٹھہرے

جو بند باندھے جائیں، ان میں ہو پائیداری
ڈھلوان بستیوں کی لازم ہے پختہ کاری

ہرگز نہ ندیوں میں کچرے بہائے جائیں
سیلاب کی زمیں پر گلشن کھلائے جائیں

■

Mohd Rafi Ansari
Al-Madni Complex, 734, Bhusar Mohalla
Bhiwandi-421308
Distt Thane (Maharashtra)

ذکیہ مشہدی

روٹی کیوں پھولتی ہے؟

دانیال جب ناراض ہوتے ہیں تو منہ پھلا کر کونے میں کھڑے ہوجاتے ہیں۔ آج کل وہ چھٹیوں میں اپنی دادی کے پاس آئے ہوئے تھے۔ برسات کا موسم شروع ہوگیا تھا۔ بادل خوب امنڈ کر آئے۔ پھر بارش ہونے لگی۔ دانیال باہر جا کر بارش میں بھیگنا چاہتے تھے۔ دادی نے منع کردیا۔ موسم کچھ ایسا ہورہا تھا کہ کبھی سخت گرمی تو کبھی مرطوب ہوا۔ کچھ لوگوں کو کھانسی نزلہ ہورہا تھا۔ دادی نے کہا بھیگنے سے بیمار پڑ گئے تو چھٹیاں غارت ہوجائیں گی۔ بس دانیال منہ پھلا کر ایک طرف کو کھڑے ہوگئے۔

دوپہر کے کھانے کا وقت تھا۔ کھانا میز پر آچکا تھا۔ دادی نے آواز لگائی۔ ”آؤ بچے کھانا کھالو۔ دیکھو نسیمہ آپا نے گرم گرم پھولی ہوئی روٹیاں پکائی ہیں۔“

”ایسی گول اور پھولی ہوئی ہیں جیسے دانیال بھیا کا منہ۔“ نسیمہ نے انھیں چھیڑا۔

دانیال کو بھوک لگی ہوئی تھی۔ گرم گرم پھولی پھولی روٹیوں کی بات سن کر وہ غصہ بھول گئے اور ٹیبل پر آگئے۔

”پہلے جا کر ہاتھ دھوئیے۔ دادی نے تنبیہ کی۔ کھانے سے پہلے ہاتھ خوب اچھی طرح دھو لینے چاہئیں۔ دانیال بھاگ کر واش بیسن پر چلے گئے۔ صابن لگا کر ہاتھ اچھی طرح دھوئے پھر رنگ میں لگی چھوٹی تولیہ سے پونچھ کر آگئے۔ تب نسیمہ نے ان کی پلیٹ میں توے سے اتاری پھولی ہوئی روٹی لا کر ڈالی۔ دانیال کی پسند کا انڈے آلو کا سالن بھی تھا۔

”بہت گرم ہے۔“ دانیال نے پھولی ہوئی روٹی میں انگلی ماری۔ بھاپ سے انگلی میں جلن محسوس ہوئی۔ جلدی سے اسے منہ میں ڈال لیا۔ اب روٹی پچک چکی تھی۔

دادی۔ دادی۔ روٹی کیوں پھولتی ہے۔

یہ اچھا سوال پوچھا تم نے۔ دادی نے کہا۔ پہلے کھانا کھالو، پھر بتاتے ہیں۔

کھانا کھالینے کے بعد دادی نے بتایا۔

”تمہیں معلوم ہے روٹی عام طور پر گیہوں کے آٹے سے بنتی ہے۔“

”معلوم ہے دادی۔ کچن میں کنستر بھر کر گیہوں کا آٹا رکھا ہے۔“

”ہاں۔ اسٹور روم میں گیہوں بھی ہے جو گاؤں سے آیا

ہے۔آٹا ختم ہوگا تو اسے پِسوا کر آٹا بنوالیا جائے گا۔روٹی پکانے سے پہلے اس آٹے کو گوندھا جاتا ہے۔

دانیال نے سر ہلایا۔’’جانتے ہیں‘‘ دانیال اکثر کچن میں گھسے رہتے تھے۔

’’گیہوں میں ایک چیز ہوتی ہے جسے گلوٹن (Gluten) کہتے ہیں۔ یہ ایک قسم کا پروٹین ہوتا ہے۔تم ابھی چوتھے اسٹینڈرڈ میں ہو۔اگلے سال شاید تمھیں پروٹین کے بارے میں کلاس میں بتایا جائے۔ بہرحال اس پروٹین کی وجہ سے آٹے میں لچک پیدا ہوتی ہے اور وہ کھینچا جاسکتا ہے۔تم نے نسیمہ آپا کو یا ہمیں روٹی بیلتے دیکھا ہوگا۔ لچک کی وجہ سے ہی روٹی بڑھتی ہے۔ بہت سے لوگ تو بہت بڑی بڑی روٹیاں بنا لیتے ہیں۔‘‘

’’جیسے رومالی روٹی جو ہم نے ہوٹل میں کھائی تھی۔‘‘

’’شاباش۔ٹھیک بتایا۔‘‘ دادی نے کہا۔

’’آٹے کو لوچ دار بنانے کے علاوہ یہ پروٹین اس میں ایک جال سا بنا دیتا ہے۔اس کے ننھے ننھے خانوں میں گیس کے بلبلے پھنس جاتے ہیں۔روٹی جب توے پر ڈالی جاتی ہے تو گرمی سے بھاپ بنتی ہے۔ یہ بھاپ گلوٹین کے ننھے ننھے خانوں کو پھلا کر اوپر کی طرف دھکیلتی ہے اور روٹی پھول جاتی ہے۔‘‘

دانیال نے سر ہلایا۔جیسے وہ اچھی طرح سمجھ گئے ہوں۔

’’گرمی سے روٹی کے اندر بھاپ بنتی ہے۔وہ آٹے میں موجود گلوٹین کے جال کو اوپر کی طرف دھکا دیتی ہے۔اسی سے روٹی پھول جاتی ہے۔‘‘ انھوں نے دوہرایا۔اور بولے ’’ارے دادی پوریاں بھی تو پھولتی ہیں اور گول گپّے بھی۔‘‘

’’وہ بھی اسی اصول کے تحت پھولتے ہیں۔فرق یہ ہے کہ انھیں گرم تیل سے گرمی ملتی ہے۔‘‘ وہ تیل میں تلے جاتے ہیں۔

’’رات کے کھانے میں پوری کھلائیں گی دادی؟‘‘ دانیال نے کہا۔

’’ضرور۔بشرطیکہ تم ساتھ میں ہری سبزی بھی کھاؤ۔ہری سبزی صحت کے لیے بہت فائدہ مند ہے۔اسے کھانے کو کہا جائے تو روٹی کی طرح منہ مت پھلانا۔‘‘ دادی نے پیار سے سر پر چپت لگاتے ہوئے کہا۔

■

Zakia Mashhadi
F-1, Grand Pallavi Court
Judges Court Road,
Patna - 800004 (Bihar)

محمد داؤد

گدڑی کے لال

گلی کے نکڑ پر کھڑے ایک کباڑی مزدور نے کہا۔ بابو جی۔ کچھ ردّی کچھ کباڑ — ؟ ہاں ہاں ہے۔ چلو میرے ساتھ۔ اپنا ٹھیلہ وہیں چھوڑ وہ ہمارے ساتھ ساتھ ہولیا۔ پوچھا کباڑی کا کام کیوں کررہے ہو؟ ابھی تو تم جوان ہو۔ ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے۔ زیادہ سے زیادہ اٹھارہ بیس سال ہوگی — جی ایسا ہی ہے۔ بات یہ ہے میں پڑھا نہیں ہوں — پڑھے نہیں یا کسی نے پڑھایا نہیں؟ بابو جی بات یہ ہے ہمارے گھر والوں نے پڑھنے تو روز بھیجا پر ہم نے پڑھ کر ہی نہیں دیا۔ میرے ابا روز مجھے مدرسے لے جاتے اور میں روز مولی (مولوی) صاحب کی آنکھ بچا کر رفو چکر ہو جاتا۔ کتابیں پھاڑ دیتا۔ چھٹی کے وقت گھر چلا جاتا۔ میرے ابا مجھے پھر چھوڑ جاتے آخر کیا کرتے۔ وہ مجھے مدرسے بھیجتے بھیجتے تھک گئے اور میں مدرسے سے بھاگتے بھاگتے نہیں تھکا۔ آخر ایک دن وہ اللہ کو پیارے ہوگئے اور میرے ہاتھ میں کباڑ ڈھونے کی رکشا آگئی۔ آج تقدیر کو روتا ہوں۔ میں نے اپنے اوپر کتنا ظلم کیا ہے۔

کیا نام ہے — جی سکھیل — کیا شکیل احمد؟ ہاں جی ہاں۔ اچھا اگر پڑھنے کی بات آنے لگے تو پڑھ لو گے — جی ضرور۔ مگر میرا تو گھر بھی نہیں بس ایک چھوٹی سی کٹیا ہے اور ماں ہے۔ وہ کہیں سے روٹی لے آتی ہے یا کسی وقت خود بھی بنا لیتی ہے اور ہم دونوں کھا لیتے ہیں — اچھا دیکھو — ابھی وقت نہیں گزرا ہے۔ ابھی تمہارے پڑھنے کے چالیس سال اور باقی ہیں۔ کوئی بات نہیں۔ اب تک نہیں پڑھا اب پڑھ لو۔ صبح کا

بھولا شام کو گھر آجائے تو بھولا نہیں کہا جاتا۔ آؤ چلو میرے ساتھ۔

مزدور نے سارا کباڑ۔ جو بہت اچھی حالت میں تھا ایک جگہ اکٹھا کرلیا۔ پھر اپنی رکشا (ریڑھی) میں بھرلیا اور دس دس کے تین نوٹ ہمارے آگے بڑھا دیے۔ ہم نے کہا نہیں یہ بہت کم ہیں۔ اُس نے پھر دس اور رکھ دیے۔ نہیں یہ ابھی بھی کم ہیں اور بالآخر پچاس کردیئے۔ ہم نے کہا اچھا بیٹھو— پہلے پانی پیو اور پھر ہماری بات غور سے سنو— دیکھو یہ بیس روپے لو— آج ہی اپنے بال کٹواؤ۔ یہ دس روپے لو— ان کا صابن لو۔ اور یہ بیس روپے اپنی ماں کے ہاتھ میں جاکر دو یا کوئی کھانے پینے کی چیز لے جاؤ۔

مزدور دیر تک ہمارا منہ تکتا رہا اور پھر بولا 'اچھا جاؤں'—

''ہاں جاؤ۔''

بات آئی گئی ہوگئی۔ ایسے واقعات اکثر ہوتے ہی رہتے ہیں۔ ہمارے ذہن میں نہ یہ واقعہ رہا نہ وہ شکل رہی اور نہ نام— ایک دن اچانک ایک نوجوان جو صاف ستھرے کپڑوں میں تھا رکشا سے اترا اور مسکراتا ہوا ہماری طرف بڑھا— السلام علیکم— وعلیکم السلام— کون صاحب۔ ہم پہچانے نہیں—! جناب عالی میں وہی پرانا 'سکھیل' ہوں جسے آپ نے شکیل بنا دیا۔ آپ نے اپنے یہاں سے بہت ساری ردّی دی تھی اور اس کی قیمت پچاس روپے بھی مجھے لوٹا دی تھی۔ یہ کہتے ہوئے کہ ان بیس روپے سے اپنے بال کٹوانا۔ دس روپیہ کا صابن لینا اور بیس روپے اپنی ماں کو دے دینا یا کچھ کھانے پینے کو لے جانا اور یہ بھی کہا تھا۔ تم نوجوان ہو۔ ابھی تمہاری پڑھنے کی عمر ہے۔ تم پڑھو اور کام بھی کرو۔ اللہ کسی کی محنت کو رائیگاں نہیں کرتا۔ اب میں سکھیل نہیں ''شکیل احمد'' ہوں۔ الحمدللہ میں نے دن میں کام اور رات کو پڑھنا شروع کردیا تھا۔ کچھ سامان لاکر ماں کو دے دیا تھا اور اپنی کٹیا کے ایک کونے کو صاف کرکے بچوں کے مطلب کی چیزیں وہاں لاکر رکھ دی تھیں۔ ہمارا یہ کونا پھیلتا گیا اور ہماری کٹیا کچھ دنوں میں چھوٹی سی دوکان بن گئی۔ میں تھوک کا سامان دوکانداروں کو لاکر دینے لگا۔ آج اللہ کا شکر ہے میری اپنی دوکان ہے۔ رہنے کا کمرہ الگ ہے۔ ماں تو چلی گئی پر جانے سے پہلے میری شادی کرگئی۔ اللہ کا شکر ہے مجھے سسرال سے کچھ سہارا تو ملا ہی تھا۔ پڑھی لکھی بیوی نے اس میں اور چار چاند لگا دیئے۔ ایک بار مجھے ردّی میں بڑی قیمتی قیمتی کتابیں مل گئیں۔ مجھے خوب نفع ہوا۔ اب میری اپنی دکان ہے سب کام چھوڑ کر ردّی ہی کا کام کررہا ہوں۔ بڑی اچھی گزر بسر ہورہی ہے۔ اب میں ٹھیلہ لیے نہیں پھرتا بلکہ لوگ خود میرے پاس آتے ہیں۔ بڑی بڑی نایاب چیزیں قیمتی پرانی کتابیں آجاتی ہیں۔ میں نے ایک پیپر مل سے بھی بات چیت کررکھی ہے۔ مہینے میں ایک دو بار وہاں مال بھیج دیتا ہوں۔ میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں۔ آپ نے مجھے 'سکھیل' سے 'شکیل' ہی نہیں بنا دیا بلکہ انسان بنا دیا۔ آپ نہ ملتے تو میں یوں ہی جوتیاں چٹخاتا دَر دَر مارا پھرتا نہ گھر ہوتا نہ در۔

ہم نے شکیل احمد کو اپنے سینے سے لگایا۔ پیٹھ ٹھونکی اور بس ایک ہی بات کہی دیکھو جب کبھی بھی کسی کے ساتھ احسان کرنے کا موقع ملے تو چوکنا مت۔ تم واقعی گدڑی کے لال ہو۔

■

Dr. M. Dawood
Multani Clinic, Lohari Sarai
Nagina - 246762 (UP)
Mob.: 992772158

بچوں نے دادا جان سے کہا کہ روز دادی جان انھیں کہانی سناتی ہیں، آج دادا جان انھیں کہانی سنائیں۔ دادا جان مسکرائے اور بولے کہ وہ کہانی سنادیں گے مگر شرط یہ ہے کہ درمیان میں کوئی کچھ نہ بولے ورنہ وہ وہیں رُک جائیں گے۔ بچوں نے وعدہ کرلیا کہ وہ درمیان میں کچھ نہیں بولیں گے تب دادا جان نے انھیں یہ کہانی سنائی: بچو! ایک تھے مرزا شکایت بیگ جو ہر وقت گلہ، شکوہ کرتے رہتے تھے۔ اپنی اِس عادت کی

بچوں کے لیے
دادا جان کی کہانی

وجہ سے وہ اللہ کا شکر ادا کرنے کی سعادت سے بھی محروم تھے۔ اُن کے منہ پر ہمیشہ کسی نہ کسی کی شکایت ہوتی تھی۔ کبھی وہ اپنی قسمت کا شکوہ کرنے بیٹھ جاتے اور اللہ کی ناشکری کرنے لگتے۔ اُن کی بیگم اُن کی اس عادت سے بہت تنگ تھیں اور دعا مانگتی تھیں کہ اللہ اُن کی یہ بری عادت چھڑادے تاکہ وہ بے چینی اور بے قراری سے نجات پاکر سکون اور اطمینان سے رہیں۔ اُن کو اپنی بیگم سے بھی بہت شکایتیں تھیں اور وہ ان کی خامیاں

گنواتے گنواتے اپنی قسمت کا شکوہ کرنے بیٹھ جاتے۔ اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ اُن کی بیگم کی دعائیں قبول ہوئیں اور اُن کے پڑوس میں ایک صوفی صاحب آگئے جو نہایت دین دار اور سنجیدہ تھے۔ وہ ملنسار بھی تھے اور انھیں معلوم تھا کہ اللہ تعالیٰ نے پڑوسیوں کا بڑا حق رکھا ہے اور اُن کی خبر گیری کی ہدایت کی ہے، یہاں تک کہ ہمارے نبیؐ نے فرمایا کہ اللہ کی قسم! وہ شخص مومن نہیں جو خود تو پیٹ بھر کر کھالے اور اُس کا پڑوسی بھوکا

سوئے۔ اس ہدایت کے پیشِ نظر صوفی صاحب کے گھر والوں نے مرزا صاحب اور اُن کے گھر والوں سے میل ملاپ بڑھایا۔ رفتہ رفتہ انھیں تمام حالات معلوم ہوئے تو صوفی صاحب نے ارادہ کیا کہ نرمی اور حکمت سے مرزا صاحب کو سمجھائیں گے تاکہ انھیں برا بھی نہ لگے اور وہ سدھر جائیں۔ صوفی صاحب کو علم تھا کہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی اسی طرح تبلیغ کرنے کی ہدایت کی ہے۔

چنانچہ انھوں نے یہی طریقہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ کبھی وہ مرزا صاحب کو اپنے گھر بلا لیتے، کبھی اُن کے گھر چلے جاتے اور کبھی فارغ اوقات میں قریبی پارک میں جا کر ان سے باتیں کرتے رہتے۔ ایک روز موقع غنیمت جان کر انھوں نے مرزا صاحب کو یہ کہانی سنائی: کسی ملک میں ایک بادشاہ تھا جس کا وزیرِاعظم جو اُس بادشاہ کے باپ کے زمانے سے تھا اور بہت عمر رسیدہ ہو چکا تھا، وفات پا گیا۔ اب بادشاہ کو نئے وزیرِاعظم کی تلاش ہوئی۔ کسی نے مشورہ دیا کہ پرانے تجربہ کار درباریوں میں سے ایک مناسب شخص کا بطور وزیرِاعظم انتخاب کر لیا جائے۔ بادشاہ کو یہ تجویز پسند آئی اور اُس نے بہت غور و خوض کے بعد تین آدمیوں کا انتخاب کیا جن میں سے کسی ایک کو وزیرِاعظم بنانا تھا۔ اس بادشاہ نے اگلی صبح باری باری تینوں کو بلایا اور سب کو تین مختلف مقامات پر یہ کہہ کر روانہ کیا کہ وہ اس جگہ کا اچھی طرح جائزہ لیں اور پھر بادشاہ کو اس کے بارے میں بتائیں۔ تینوں اپنی اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔ پہلا شخص واپس آیا تو اُس نے یہ کہا کہ اُس جگہ کچرے کا ڈھیر تھا جس کی وجہ سے وہ جگہ بہت بدنما لگ رہی تھی، معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کے رہنے والے صفائی پسند نہیں ہیں اور نہ کسی کو اس بات کا خیال ہے کہ علاقے کو صاف ستھرا کیا جائے۔ بادشاہ نے کہا ٹھیک ہے اور اس کا کہا ہوا لکھ کر اُس کے دستخط لے لیے۔ پھر دوسرا شخص واپس آیا اور اس نے بھی یہی کہا کہ وہاں کوڑے کا ڈھیر تھا جو یہ ظاہر کر رہا تھا کہ وہاں کے لوگ بہت کاہل اور گندے ہیں۔ بادشاہ نے اس کی بات بھی لکھی اور اس سے دستخط کرا لیے۔ تیسرا شخص بہت دیر سے واپس آیا۔ بادشاہ نے پوچھا کہ تم اتنی دیر سے کیوں آئے؟۔ اُس شخص نے کہا، بادشاہ سلامت! جب میں وہاں

گیا تو وہاں کوڑا کباڑ پڑا تھا جو بہت برا لگ رہا تھا حالانکہ آس پاس کے گھر بہت اچھے تھے۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا تو مجھے کچھ دور ہی ایک کوڑا گھر نظر آیا۔ میں نے کچرے کی کئی گٹھریاں بنائیں اور انھیں کوڑا گھر میں ڈال آیا۔ اس طرح میں نے سڑک کی صفائی کر دی۔ کچرے کے اندر سے مجھے ایک بیگ ملا جو شاید کسی نے غلطی سے وہاں پھینک دیا تھا، میں اسے اپنے ساتھ لے آیا ہوں تاکہ آپ اسے اس کے اصل مالک کو دلوانے کا انتظام کریں اور فی الحال سرکاری بیت المال میں رکھوا دیں۔ بادشاہ یہ سن کر مسکرایا اور اُس نے کہا: وہ بیگ میں نے خود وہاں رکھا تھا، اسے کھول کر دیکھو۔ جب اُس شخص نے بیگ کھولا تو اُس میں اُس کا بطور وزیرِاعظم تقرر نامہ رکھا تھا۔ بادشاہ نے کہا کہ میں ایسے شخص کو اپنا وزیرِاعظم بنانا چاہتا تھا جو دوسروں کی شکایت کرنے کی بجائے خود عمل کرے، اس کے دل میں لوگوں کی خدمت کا جذبہ ہو کیونکہ قوم کا سردار قوم کا خادم ہوتا ہے (سید القوم خادمھم)۔ اگر ہر شخص دوسروں

کی شکایت کرنے کی بجائے خود عملی قدم اُٹھائے اور ترقی کرنے کی کوشش کرے تو ہمارا ملک ایک مثالی ملک بن جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے سورہ نمبر 53 میں فرمایا ہے کہ انسان کو وہی کچھ ملتا ہے جس کے لیے وہ کوشش کرتا ہے۔ لوگ پیٹھ پیچھے شکایتیں کر کے غیبت کا گناہ اپنے سر لیتے ہیں جس کی سورہ نمبر 49 میں سختی سے ممانعت ہے۔ مرزا صاحب یہ کہانی سن کر بہت متاثر ہوئے۔ اب انھیں صوفی صاحب کی باتیں اچھی لگنے لگی تھیں۔ ایک دن صوفی صاحب نے انھیں شیخ سعدی کا واقعہ سنایا کہ وہ کسی مسجد میں نماز پڑھنے گئے اور وہاں اُن کے جوتے غائب ہو گئے۔ وہ ننگے پیر مسجد سے باہر آئے۔ اُن کے پاس دوسرے جوتے خریدنے کے لیے رقم بھی نہیں تھی۔ انھیں بہت غصہ آ رہا تھا وہ اللہ تعالیٰ سے شکوہ کرنے لگے۔ اتنے میں اُن کی نظر ایک ایسے شخص پر پڑی جو دونوں ٹانگوں سے معذور تھا اور گھسٹ گھسٹ کر چل رہا تھا۔ شیخ سعدی نے اُس شخص کی یہ حالت دیکھ کر اللہ کا شکر ادا کیا کہ اللہ نے ان کو چلنے کے لیے پیر تو دیے ہیں، جوتے نہیں ہیں تو کیا ہوا۔ اُن کو قرآن کی یہ آیت یاد آ گئی کہ اگر تم شکر کرو گے تو میں تمھیں اور دوں گا اور اگر ناشکری کرو گے تو میرا عذاب شدید ہے (سورہ نمبر 14، آیت نمبر 7)۔ ایسے ہی واقعات اور حکایات سن سن کر رفتہ رفتہ مرزا صاحب بالکل بدل گئے اور اب اُن کا نام مرزا شکایت بیگ نہیں بلکہ مرزا قناعت بیگ ہے: کہانی ختم ہوئی تو بچوں نے کہا، دادا جان! شکریہ۔

■

Tanwir Phool
22 Lake Shore Drive, Apt
2-C, Watervliet
New York 12189(USA)

سورج

سورج بچّوں سے بولا میں ہوں جگ کا اُجیالا
اندھیارے کو دور بھگاؤں سونے والوں کو میں جگاؤں
دھوپ کے ہاتھ پہ رکھ کر پھول تم کو میں بھیجوں اسکول
ایک ہوں میں پر کئی ہیں نام کتنے ہی کام میں دو انجام
سردی دور بھگاتا ہوں جمی برف پگھلاتا ہوں
میرے ہی دم سے ہو برسات دوں میں فصلوں کی سوغات
چاند میں ہے میری ہی چمک تاروں میں میری ہی دمک
پھولوں میں رنگت میری نکہت اور نزہت میری
روشنی میں ہوں میں ہی میں چاندنی میں ہوں میں ہی میں
بھری ہے مجھ میں آگ ہی آگ مگر میں گاؤں جیون راگ

سر پورب سے اُٹھاتا ہوں
پچھّم میں چُھپ جاتا ہوں

■

Dr. Mujeeb Shahzar
159/9, Tan Tan Para
Kankar Wali Gali
Aligarh - 202001 (UP)

سراج فاروقی

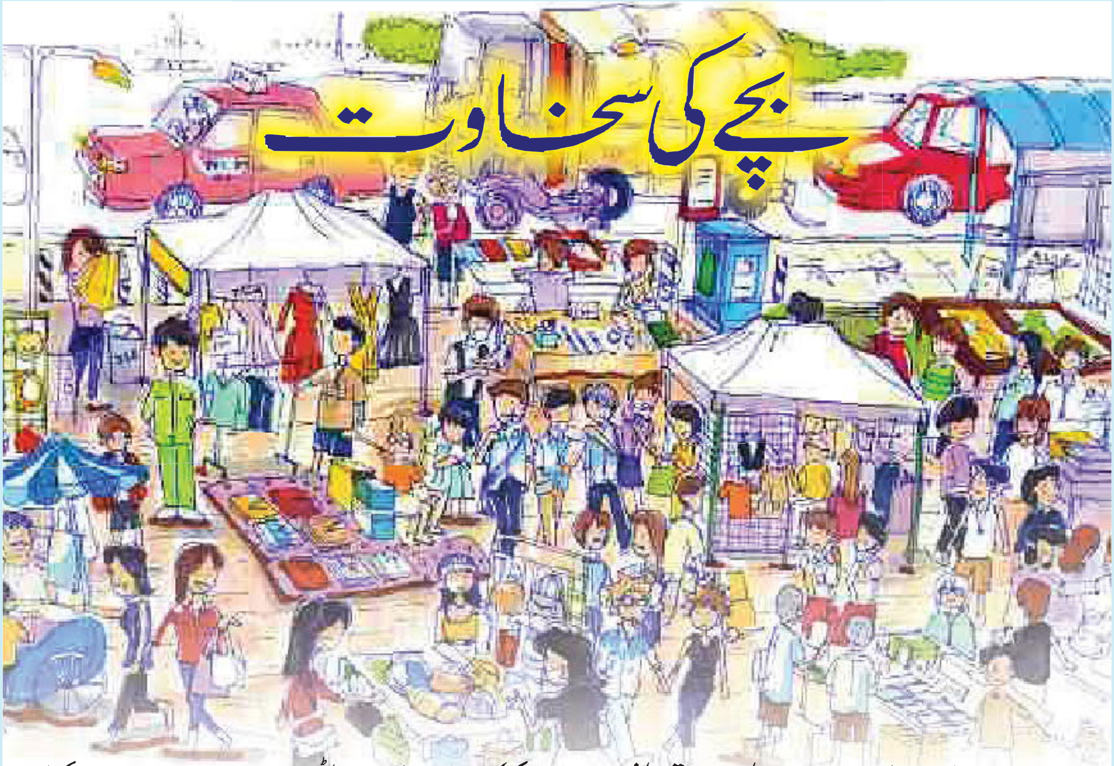

بچے کی سخاوت

رمضان اپنے آخری اَیام میں ہے، اہل مومن تشویش میں مبتلا ہیں کہ رمضان جلد چلا جائے گا اور جو لاپروا یا دنیا والے ہیں خوش ہیں کہ جلدی چلا جائے۔ تاکہ ساری پابندیاں ختم ہوں اور آزادی سے کھائیں پئیں، گھومیں۔

اکثر میں افطاری کا سامان خریدنے مسلمان ناکے پر جایا کرتا تھا۔ آج جب ساڑھے چھ کا وقت ہوا تو سامان لینے گیا۔ ساتھ میں میرا دس سالہ لڑکا افضل بھی تھا۔ جب میں بائیک کھڑی کرنے لگا تو افضل سے دریافت کیا، ”بیٹا! اَمی نے کیا کیا منگایا ہے.....؟“

افضل نے ذہن پر زور ڈالتے ہوئے کہا، ” کباب، شورمہ، نان، فالودہ، پپیتا، (تربوز) دودھ، کیلا اور مالپوا.....“

”ٹھیک ہے ...“ میں نے کہا اور بائیک کی سیٹ پر ہاتھ مار کر کہا، ”آپ یہیں پر بیٹھیں ....میں سب سامان خرید کر آتا ہوں....“ بازار میں بھیڑ ہونے کی وجہ سے میں نے اسے ساتھ لے جانا مناسب نہیں سمجھا۔

اس نے ہاں میں گردن ہلائی اور بائیک کی سیٹ پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا۔

میں ناکے پر پہنچا۔ بڑی گہما گہمی تھی۔ گاڑیوں کی چیخ و پکار مچی تھی۔ کوئی اِدھر سے تو کوئی اُدھر سے آ جا رہا تھا۔ ایک ہنگامہ سا برپا تھا۔ سب کو اپنی اپنی منزل پر پہنچنے کی جلدی تھی۔ اِسی دُھن میں سبھی ایک دوسرے کے لیے مسئلہ بنے ہوئے تھے۔ سڑک کے دونوں جانب فالودہ، چکن، کباب، بیکری کے آئٹمس، رَس ملائی، رَبڑی، بھَجیا، جلیبی، کھجور، مالپوا، اور پھل کی متعدد دکانیں سجی تھیں۔ نیز اُن کے دوکان دار طرح

طرح کی دلچسپ آوازیں لگا لگا کر گراہک کو اپنی طرف متوجہ کر رہے تھے۔ اور گراہک تھے کہ اپنی ضرورت کی چیزوں پر مکھیوں کی طرح گرے پڑتے تھے۔

وقت جوں جوں افطاری کا نزدیک آتا جاتا تھا۔ بھیڑ میں مزید اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ اِنھیں بھیڑ میں سے میں بھی اپنی ضرورت کی چیزیں خرید رہا تھا۔

اسی اثناء میں افضل مجھے تلاش کرتا پاس آیا۔ ''ابو ... ابو ...'' اس نے کہا تو میں نے چونک کر اسے دیکھا، ارے یہ یہاں کہاں؟

''کیا ہوا بیٹا؟'' میں نے سوال کیا تو اس نے کہا۔

''کیا کیا لیا....؟''

میں نے ہلکے سے ہنس کر جواب دیا، ''سب لے لیا۔ بس کباب لینا باقی ہے...''

افضل نے جلدی سے کہا، ''وہ مت لو......''

''کیوں...؟'' میں نے سوال کیا تو اس نے معصومانہ لہجے میں کہا، ''آج ہم لوگ کباب نہیں کھائیں گے.....''

'' پھر ....؟'' میں نے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا تو اس نے کہا، ''لائیے کباب کے پیسے مجھے دیجئے...''

میں نے سوچا، بچہ ہے۔ کچھ کھانے کا جی کیا ہوگا، اس لیے ایسا کہہ رہا ہے۔ میں نے جلدی سے جیب میں ہاتھ ڈالا اور کباب کے بیس روپئے دے دیے...''

وہ روپئے لے کر آگے آگے اور میں پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ میں سمجھا کہیں کچھ خریدے گا، مگر اُس نے خریدا نہیں۔ آہستہ آہستہ بائیک تک آیا اور بائیک سے آگے بڑھ گیا۔ میں نے کچھ نہیں کہا۔ میں بائیک کے پاس کھڑا اُسے تعجب بھری نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

اچانک !میں نے دیکھا، بائیک سے تھوڑا آگے نالے کے پاس ایک عمر دراز شخص کھڑا ہے۔ اس کے چہرے پر سفید داڑھی ہے۔ رنگ سانولا۔ سر پر سفید جالی والی ٹوپی، سفید رنگ کے کُرتے پاجامے میں ملبوس۔ اس کے پاس ایک خاتون بھی ہے، جو اس سے قدرے چھوٹی ہے۔ لیکن وہ بھی عمر میں اس کے برابر ہے۔ سفید شلوار قمیض میں ہے۔ اس کی آنکھوں پر سیاہ چشمہ ہے۔ شاید نابینا ہو، یا نا بھی ہو۔ ان دونوں کے درمیان ایک 5-6 سال کی بچی کھڑی ہے۔ عمر دراز شخص ہر آنے جانے والے کو قدرے جھک کر لکھنوی انداز میں آداب بجالاتا ہے اور اسی کے ساتھ نہایت ہی عاجزی سے دست طلب پھیلا دیتا ہے۔ مگر کوئی نہیں دیتا ہے۔ وہ اپنے ہاتھ ندامت سے سمیٹ لیتا ہے اور جب دیکھتا ہے کوئی آرہا ہے تو پھر آداب میں جھک جاتا ہے۔ اس کے اطوار سے ایسا لگتا ہے۔ وہ پیشے سے بھکاری نہیں ہے۔ کسی خاص مجبوری یا لاچاری کے تحت ایسا کر رہا ہے۔ خیر افضل لپک کر اس کے پاس گیا اور اس کے دست طلب پر بند مٹھی کے ساتھ بیس روپے رکھ دیے۔ میرے منہ سے بے ساختہ واہ نکل گیا۔ وہ بزرگ شخص دعائیں دینے لگا۔

مجھے آج اپنے بیٹے پر بڑا فخر ہوا۔ میں نے سوچا ابھی سے یہ تیور ہیں تو اللہ جانے آگے کیا ہوگا؟ اس کی یہ ادا مجھے بہت اچھی لگی اور میں سوچنے لگا، ادھر سے لوگ کتنا جھولا بھر بھر کر جا رہے ہیں۔ اگر آج سبھی اپنے کباب کا یا کسی ایک چیز کا پیسہ اس غریب ضرورت مند کو دے دیں، تو وہ بے چارہ خوشحال ہو جائے گا اور اس کی عید کی خوشیاں دوبالا ہو جائیں گی۔

■

Siraj Farooqui
703, Wadghar, Panvel - 410206
Distt: Raigadh
Navi Mumbai (Maharashtra)

تسنیم فاطمہ

اللہ کی مدد

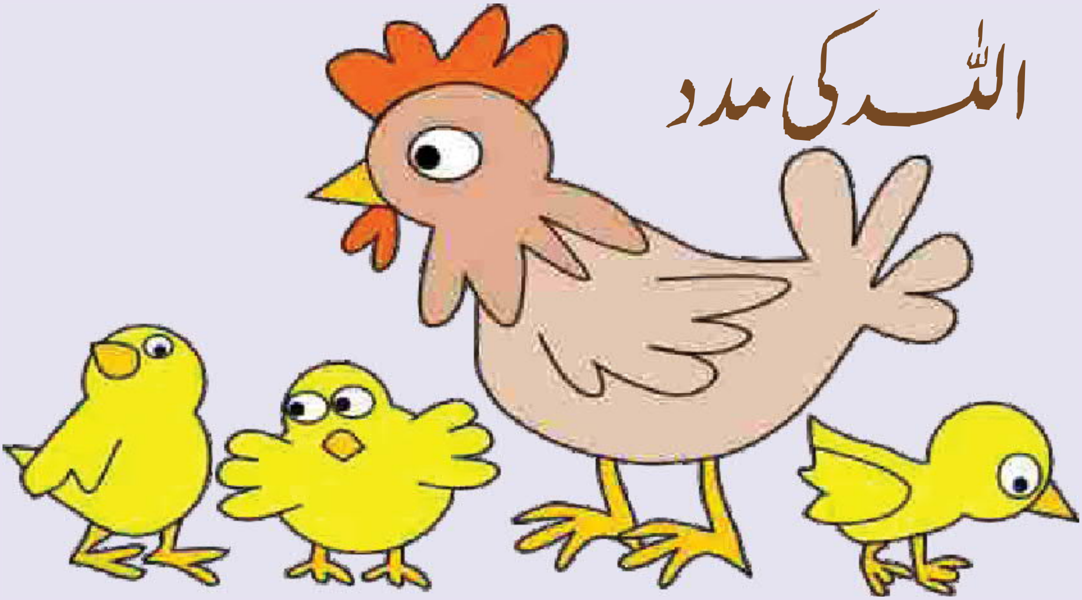

لال مرغی نے دس انڈے دیے تھے۔ آج کل اس کا کام بس انڈوں کو سینا اور ان کی حفاظت کرنا تھا۔ ایک دن صبح صبح انڈوں سے بچے نکل آئے۔ ننھے منے خوبصورت چوزوں کو دیکھ کر مرغی کا دل باغ باغ ہوگیا۔ اب اس کی ذمہ داری اور بڑھ گئی تھی۔ چوزوں کو دانہ دنکا کھلانا، ان کی حفاظت کرنا اور ان کی تربیت کرنا اب مرغی کا کام تھا۔

دھیرے دھیرے چوزے بڑے ہونے لگے۔ مرغی ان کو سکھاتی تھی کہ ہمیں ہر حال میں اللہ سے مدد مانگنی چاہیے، اور ہمیشہ اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے۔ خود مرغی بھی ہر مصیبت و پریشانی میں اللہ سے مدد مانگتی تھی۔

چند ماہ گزر گئے۔ اب چوزے تھوڑے بڑے ہو گئے تھے۔ ایک دن مرغی سب بچوں کو لے کر دانہ چگنے نکلی۔ بچوں نے کہا ''ماں ہمیں سیر کرا دو''، ''ٹھیک ہے، مگر تم سب میرے ساتھ رہنا اور اگر کہیں بھٹک جانا تو سیدھے گھر پہنچنے کی کوشش کرنا'' مرغی نے سمجھایا۔ ''ٹھیک ہے ماں''۔ سب بچے ایک ساتھ بولے اور ماں کے ساتھ سیر کرنے چل دیے۔

تھوڑا آگے چلنے پر مرغی کو اپنی سہیلی مل گئی، وہ وہاں رک کر اس سے بات چیت کرنے لگی۔ سارے چوزے بھی رک گئے مگر سب سے چھوٹا چوزہ جو سب سے نٹ کھٹ اور شرارتی تھا وہ آگے آگے چل رہا تھا، اس لئے اس نے مرغی کو رکتے ہوئے نہیں دیکھا اور آگے بڑھتا گیا۔ تھوڑا آگے جانے پر اس کو احساس ہوا کہ وہ اکیلا ہے اور کافی آگے آگیا ہے۔ اب تو چوزہ بہت گھبرایا، وہ پہلی بار گھر سے اتنی دور آیا تھا اس کو واپسی کا راستہ بھی ٹھیک سے یاد نہیں تھا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد آخر وہ ایک سمت کو چل پڑا۔

چوزہ بے دھیانی میں چلا جا رہا تھا، راستے میں ایک گہری نالی تھی جس میں تیزی سے پانی بہہ رہا تھا۔ چوزے کا پیر پھسلا اور وہ نالی میں گر گیا۔ بہاؤ تیز تھا وہ پانی کے ساتھ بہنے لگا۔ پہلے تو چوزہ بہت گھبرایا پھر اس کو ماں کی بات یاد آئی کہ مصیبت میں ہمیشہ اللہ سے مدد مانگنی چاہئے۔ اس نے گڑگڑا کر اللہ سے

دعا کی: ''یا اللہ مجھے اس مصیبت سے نجات دلا دے''۔ اچانک اس نے دیکھا کہ نالی میں ایک بڑا سا پتھر پڑا ہوا ہے، چوزہ کوشش کر کے اسی پتھر پہ چڑھ گیا۔ تھوڑی دیر اس نے حواس بحال ہونے کا انتظار کیا۔ پھر کود کر نالی سے نکل آیا۔

ننھا چوزہ پھر آگے بڑھا، وہ تھوڑی ہی دور چلا تھا کہ اسے سامنے سے ایک چھوٹا سا لڑکا آتا نظر آیا۔ اس بچے کی نظر جیسے ہی چوزے پر پڑی اس نے لپک کر چوزے کو اٹھالیا۔

''واہ کتنا پیارا چوزہ ہے۔ آج تو میں اس کا سوپ پیوں گا''۔ اب تو چوزہ بہت گھبرایا۔ اس نے سوچا لگتا ہے آج زندگی کے خاتمہ کا وقت آ گیا۔ مگر پھر ماں کی یاد آتے ہی اس نے اللہ سے مدد مانگی۔ چھوٹا لڑکا چوزہ ہاتھوں میں اٹھائے چلا جا رہا تھا کہ اچانک اسے ٹھوکر لگی اور وہ گر گیا۔ چوزہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرا۔ چوزہ تیزی سے ایک طرف بھاگ کھڑا ہوا۔

تھوڑا آگے جانے پر اچانک تیز ہواؤں نے آندھی کا روپ دھار لیا۔ چوزے کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ ہوا کے ساتھ انجانی سمت جانے لگا۔ وہ لاکھ کوشش کر رہا تھا مگر آندھی کے آگے اس کا کوئی زور نہیں چل رہا تھا۔ چوزہ نے پھر سے اللہ سے مدد مانگی۔ آندھی کا زور دھیرے دھیرے کم ہونے لگا۔ راستے میں ایک جھاڑی آئی۔ چوزے نے مضبوطی سے اسے پکڑ لیا۔ اب آندھی بھی کم ہوگئی تھی۔ چوزہ کچھ دیر جھاڑی کو پکڑے کھڑا رہا۔

آندھی ختم ہونے پر چوزہ ایک جانب چل پڑا۔ کچھ ہی دور جانے پر مرغی آتی ہوئی دکھائی دی۔ جو اسے ہی تلاش کرتی ہوئی آنکلی تھی۔ چوزہ دوڑ کر مرغی سے لپٹ گیا۔ مرغی اسے پیار کرتی جاتی تھی اور اللہ کا شکرادا کرتی جاتی تھی کہ اس کا بچہ اسے صحیح سلامت مل گیا۔

گھر پہنچ کر ننھے چوزے نے مرغی کو ساری روداد سنائی۔ مرغی نے کہا ''تم نے اچھا کیا کہ اللہ سے ہر موقع پر مدد مانگی، اسی لئے تم ٹھیک ٹھاک گھر پہنچ گئے۔ اب اللہ کا شکر ادا کرو کہ اس نے تمھاری مدد کی''۔ چوزہ آنکھیں بند کر کے اللہ کا شکر ادا کرنے لگا۔ ■

Dr. Tasneem Fatima
C-18-A, Shahab Villa
Begumganj, Barabanki (UP)

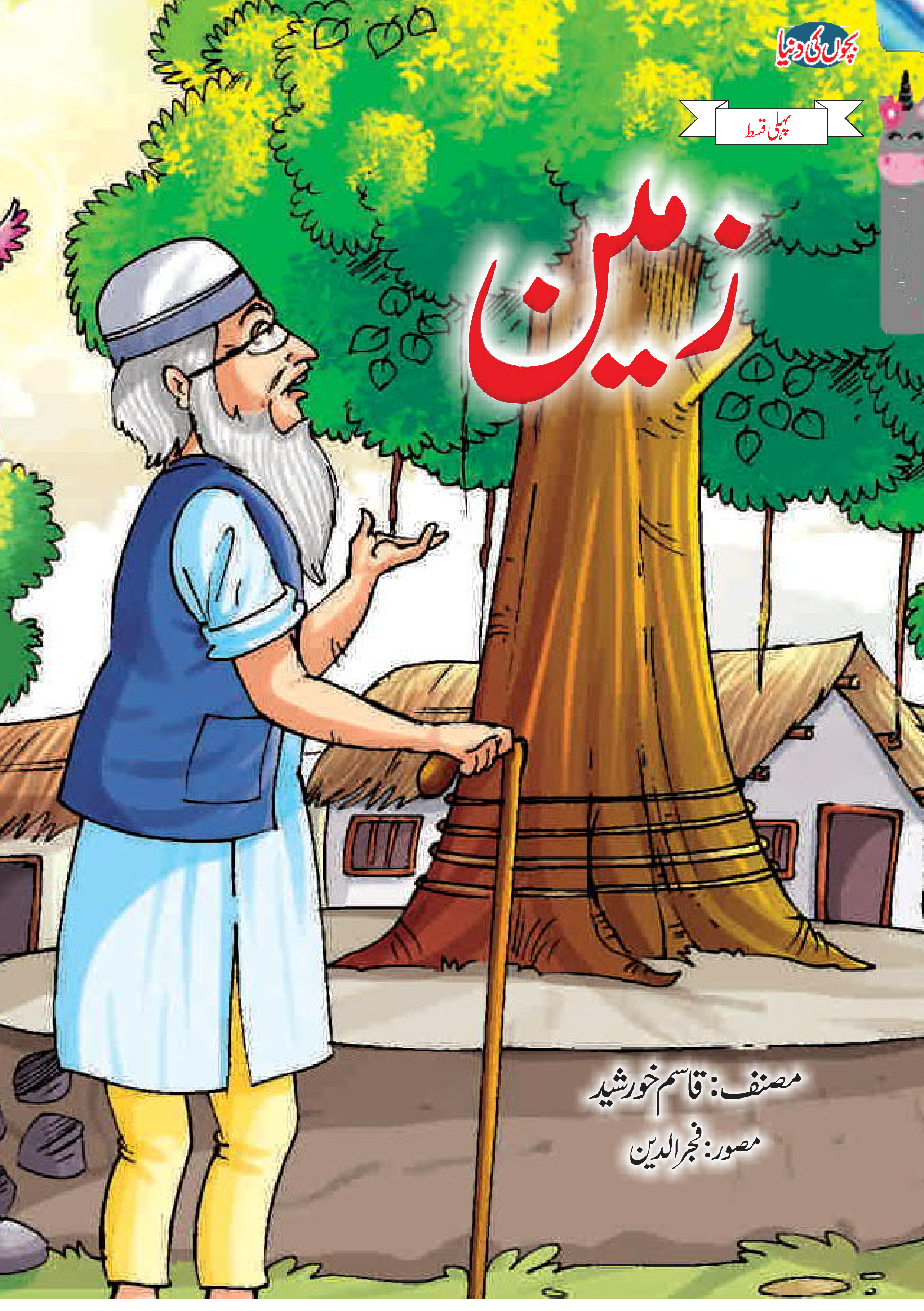

پہلی قسط

زمین

مصنف: قاسم خورشید

مصور: فجرالدین

شیتل پور گاؤں کے باہر پیپل کا ایک بڑا درخت ہے۔ اس کی بانہیں دور دور تک پھیلی ہیں سی درخت کے نیچے یک چبوترا ہے، جس پر بیٹھ کر کہانیاں سنائی جاتی ہیں۔ پنچایت کے فیصلے ہوا کرتے ہیں۔ بچے کھیلتے بھی ہیں۔ اس کی جڑوں میں پوجا کے تازہ پھول بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ یہاں چاروں طرف دھاگے بھی لپٹے ہوئے ملیں گے۔ جڑوں میں رکھے ہوئے تازہ پھولوں یا چاروں طرف لپٹے ہوئے، دھاگوں کو بچے نہ چھوتے نہ چھیڑتے ہیں۔

اسی درخت کو لے کر شیتل پور گاؤں کے ایک گھر میں زبردست تناؤ ہے۔ اور وہ گھر ہے شیخ رمضانی میاں کا۔ شیخ رمضانی پینسٹھ کے ہو چکے ہیں۔ ان کے دو بیٹے ہیں۔ شیخ کلیم اور شیخ سلیم۔ دونوں کی شادی ہو چکی ہے۔ کھیتی کے علاوہ قرآن و حدیث کا مطالعہ اور گاؤں کے اکلوتے مولوی صاحب کی تقریر سننے میں ان کی خاص دلچسپی ہے۔

ابھی جو اس گھر میں تناؤ ہے، اس سے شیخ رمضانی کے علاوہ ان کی بیوی اور شیخ رمضانی کا سات سالہ پوتا منو بہت پریشان ہیں

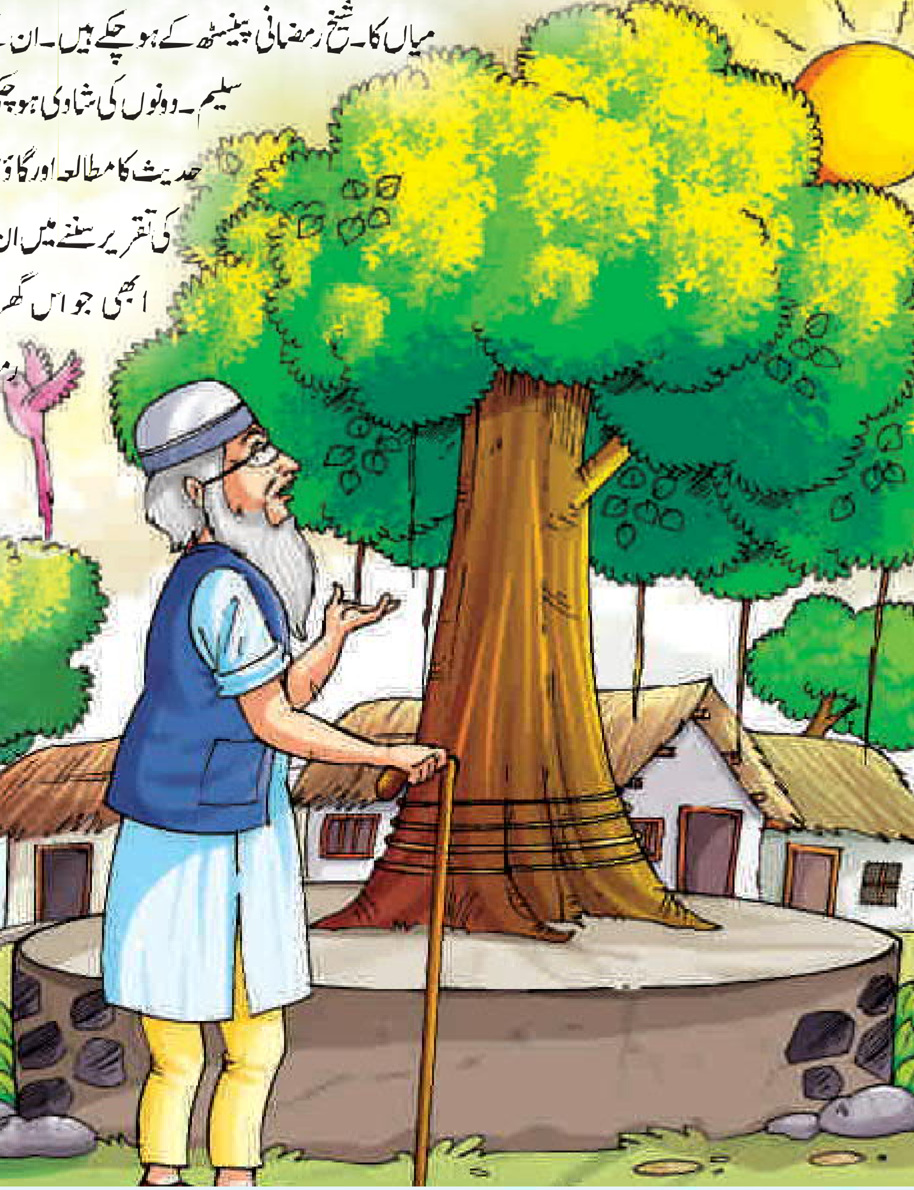

اب تو روز صبح وشام پہاڑ ٹوٹتا ہے۔منو کچھ سمجھ نہیں پاتا تو رونے لگتا ہے۔شیخ رمضانی غصے سے بھر جاتے ہیں تو اسی پیپل کے نیچے جا کر بیٹھ جاتے ہیں۔

'کھلیان سے لوٹنے پر آج پھر دونوں بیٹے، باپ پر بپھر رہے ہیں۔

'ابا! اب اور حاتم طائی نہ بنئے۔کچھ روز بعد بھوکے رہنے کی نوبت آنے والی ہے۔'

'ان کی کیا ہے؟ یہ تو آج ہیں کل گزر جائیں گے۔سارا دکھ تو ہم لوگوں کو ہی جھیلنا ہے۔'

'ہم ایک بار پھر آپ سے کہہ رہے ہیں کہ اب اور نہیں جھیلیں گے، جو فیصلہ کرنا ہے جلد ہی کر دیجیے۔'

شیخ رمضانی نے دونوں کی جلی کٹی باتیں سن کر لگ بھگ چیخ کر کہا.........'اب کیا چاہتے ہو تم لوگ۔رہی سہی عزت کو بھی مٹی میں ملا دیں؟ ارے تم لوگوں نے کیا دیکھا ہے؟ کیا کیا دکھ نہیں جھیلا ہے ہم نے۔تین تین دن بھوکے رہے

ہیں۔تم لوگ سمجھتے ہو کہ آج جس کھیت پر راج کر رہے ہو، آسانی سے مل گیا ہے؟ خون پسینہ ایک کیا ہے ہم نے۔'

'ای بات آپ بار بار مت بولئے ابا۔اس میں احسان کا ہے کا۔کون باپ اپنے بچوں کے لیے نہیں کرتا ہے آپ ہی دنیا میں اکیلے تو نہیں ہیں۔'

شیخ سلیم نے بیوی کی بات کو اور آگے بڑھاتے ہوئے کہا.......... 'کوئی گھر ایسا نہیں ہوگا۔ہم اب بار بار یہ سب نہیں سنیں گے۔ہم لوگوں کو الگ کر دیجیے، دن بھر محنت کرو، تب بھی چین نہیں ہے۔'

اب شیخ رمضانی نے بیٹے کو بہت نرم لہجے میں سمجھانے کی کوشش کی.......... 'بیٹا سب کچھ تم ہی دونوں کا ہے۔ہم کیا یہاں سے لے کر جائیں گے؟ تم کو کھیتی کے لیے زمین کم لگتی ہے تو پوکھر کے پاس والی زمین کا ہے نہیں جوتنے کی کوشش کرتے ہو۔'

شیخ کلیم نے کہا.......... 'دیکھیے ابا! یہ بات آپ کے ساتھ سارا گاؤں جانتا ہے کہ پوکھر کے پاس والی ہم لوگوں کی جو

بچوں کی دنیا

دوسری قسط

شہر میں ایک جنگل

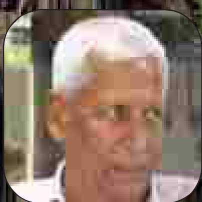

مصنف: کمارن ست سیوم
مترجم: عباس آصف

پیارے دوستو! آپ نے بچوں کی دنیا میں کئی اچھے اور مشہور ناولوں کو پڑھا ہے۔ اب ہم اس ماہ سے ایک نیا سلسلہ 'شہر میں ایک جنگل' شروع کررہے ہیں۔ اِس کے مصنف کمارن ستیہ سیوم ہیں جو ماحولیات اور جنگلاتی زندگیوں پر لکھتے رہے ہیں۔ ان کی کتاب میرین میمل آف انڈیا بھی کافی مقبول ہوئی تھی۔ انہوں نے 1990 میں یہ کتاب Forest in the City لکھی تھی۔ اِس کتاب کو ماحولیات پر بچوں کے لیے لکھی کتابوں پر پہلا انعام بھی دیا گیا تھا۔ کمارن ستیہ سیوم آئی آئی ٹی مدراس (چنئی) میں سات برسوں تک رہے تھے۔ آئی آئی ٹی اس وقت 600 ایکڑ سے بھی زیادہ کے رقبے پر پھیلا ہوا تھا اور زیادہ تر گھنے جنگلوں پر مشتمل تھا۔ کمارن ستیہ سیوم نے ان جنگلوں میں مختلف تجربات کیے تھے اور ان تجربات کو ہی کتابی شکل دی تھی جسے بچوں کی دنیا میں پیش کیا جارہا ہے۔ (ادارہ)

میں سانپ کو آہستہ آہستہ مچھلی نگلتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اُسے پوری مچھلی نگلنے میں تقریباً پانچ منٹ کا وقفہ لگا۔

ہم اگر اس جھیل کے کنارے کنارے چلتے تو درختوں اور جھاڑیوں میں چھپے ہوئے ٹڈوں کی آوازیں اس طرح آتیں جیسے قینچی سے کوئی چیز کاٹی جارہی ہو جہاں یہ ٹڈے زیادہ تعداد میں ہوتے ایسا محسوس ہوتا گویا ہم کسی بڑی نائی کی دکان میں آگئے ہوں۔ اسی لیے ہم نے ٹڈوں کو 'نائی کیڑا' کے خطاب سے نوازا تھا۔

جولائی اور اگست سے کچھ ماہ کے لیے ہم کو جھینگر کی آوازیں بھی سنائی دینے لگی تھیں۔ ان کیڑوں کے ذریعے جو آواز نکلتی وہ بھی خاصی زوردار ہوتی۔ اسے ایک ہلکی آواز کہا جائے گا تاہم یہ اس قدر تیکھی ہوتی کہ یہ یقین کرنا مشکل تھا کہ یہ ایک ہی کیڑے کی آواز ہے۔ ذرا احتیاط سے تلاش کرنے پر پتہ چلا کہ ایک بڑا سا مکھی نما کیڑا کسی ڈال پر بیٹھ کر نغمہ سرا ہے۔

جلد ہی جھیل کے کنارے کا راستہ دوسری جانب مڑتا نظر آیا۔ یہ موڑ پرندوں کی بہترین رہائش گاہ تھی۔ اس مقام پر گھنی جھاڑیاں تھیں۔ یہاں مختلف اقسام کے خودرو درخت تھے۔ کچھ ناگ پھنیاں، بہت سی کانٹے دار جھاڑیاں کچھ پام اور املی کے درخت بھی تھے۔ کچھ بیلیں بھی تھیں۔ اس نباتاتی جھرمٹ میں یقیناً کوئی ایسی بات ضرور تھی جو پرندوں کو متوجہ کرتی تھی۔

یہاں نظر آنے والی چڑیوں میں ہمیشہ جھنڈ میں نظر آنے والی چڑیاں (Loras) شوبی جی بھی تھیں۔ زرد رنگ کی توتی، ہندوستانی دھوبن نیل کنٹھ نما دھوبن کوئل اور ملکوہ دونوں کوئلوں کی نسلیں اور بلبلیں اور نہ جانے کتنے دوسرے پرندے سبھی تھے۔ سردیوں میں بیرونی علاقوں سے آئے ہوئے پرندے بھی ان میں شامل ہوجاتے۔ ماہ اکتوبر سے کوئی بھی ایسی چڑیوں کو دیکھ سکتا تھا۔ اس میں مکھی خور اور بڑی مکھی خور چڑیاں بھی تھیں۔ نرفلائی کیچر کی دم خاصی لمبی ہوتی ہے اور اس کا نظارہ بڑا مسحور کن ہوتا ہے۔ ڈاکٹر سالم علی کا دعویٰ ہے کہ اگر کوئی شخص اس پرندے

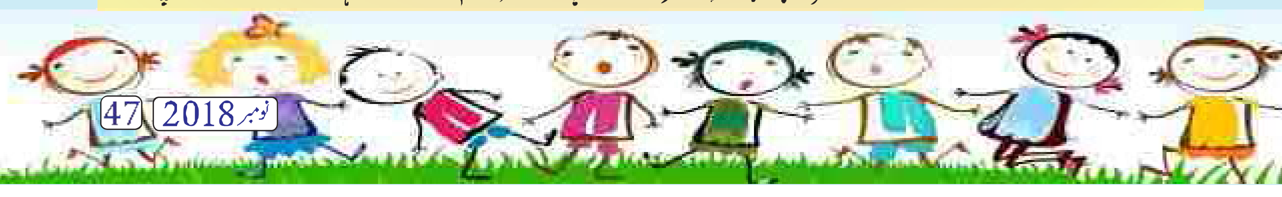

کو پہلی مرتبہ دیکھتا ہے تو وہ یہ خیال کرتا ہے کہ اس کے پروں میں سبز، نیلے اور پیلے رنگ ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس پرندے کا رنگ صرف اور صرف کالا یا سفید یا سرخ مائل بھورے رنگ جیسا ہوتا ہے جس کا انحصار اس کی عمر پر ہوتا ہے۔

اگر ہم نقل مکانی کی بات کریں تو پرندے اپنی افزائش کی جگہ سے ہر سال جس قدر دوری سے، سردی کے زمانے کو دوسرے علاقوں میں گزارنے کے لیے طے کرتے ہیں وہ علیحدہ علیحدہ نوعیت کے ہوا کرتے ہیں۔ زیادہ تر بھارتی نقل مکانی کرنے والے پرندوں کی افزائش نسل کا مقام وسطی اور شمالی یورپ ہے۔ یہ نقل مکانی کرنے والے پرندے خاص طور پر دو راستوں پر ہندوستان کا رخ کرتے ہیں۔ ایک راستہ وادئ سندھ سے ہوکر گزرتا ہے اور دوسرا راستہ ہمالیائی کنارے سے ہوکر گزرتا ہے۔

یہ راستہ برہم پتر ندی کے کنارے کا ہے۔ ان دونوں راستوں سے ہندوستان آنے والی چڑیاں باہم مل کر ملک بھر میں پھیل جاتی ہیں اور کچھ سری لنکا کا رخ کرتی ہیں۔ کچھ پرندے وسط ایشیا سے براہِ راست ہمالیہ کے اوپر سے پرواز کرتے ہیں۔ یہ پرندے پہاڑ سے 8 کلومیٹر بلند ہوکر پرواز کرتے ہیں۔ نقل مکانی کے الگ الگ زمرے ہوتے ہیں۔ اس میں ہمالیائی علاقے سے پار کا سفر بھی شامل ہے جو ہزاروں کلومیٹر کا ہوتا ہے اور مقامی نقل مکانی بھی شامل ہے جو چند کلومیٹر سے زیادہ کی نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ الگ الگ موسموں میں پہاڑی پرندے بھی بلندی سے نیچے اتر آتے ہیں۔

جاڑے کے موسم میں بیرون ملک سے نقل مکانی کرکے ہندوستان آنے والی خاص چڑیوں میں مختلف قسم کی چھوٹی بڑی جنگلی بطخیں شامل ہیں۔ ان میں ساحلی علاقوں میں رہنے والے پرندے، سارس، ابابیل، بطخیں شامل ہیں۔ ان میں ساحلی علاقوں میں رہنے والے پرندے، سارس، ابابیل، مگس خور، بلبلیں، طوطے چھوٹی چڑیاں بھی شامل ہیں۔ نقل مکانی کرنے والے پرندے شروع سردیوں میں آجاتے ہیں اور پھر موسم گرما میں کوچ کرجاتے ہیں۔ مختلف اقسام اور ان کی نقل مکانی کی کیفیت میں فرق ہوتا ہے۔ کچھ پرندے مثال کے طور پر ابابیل جلدی آجاتے ہیں۔ اگست یا ستمبر میں آجاتے اور مئی تک مقیم رہتے ہیں۔ کچھ بعد میں آتے ہیں اور بعد میں اپنے آبائی وطن کا رخ کرتے ہیں۔ یہ خیال کرنا کہ متعدد نقل مکانی کرنے والے پرندے اپنی زندگی کا زیادہ حصہ گرمی اور جاڑے کے دنوں میں نصف ایک جگہ اور نصف دوسری جگہ گزارتے ہیں، صحیح نہ ہوگا۔ نقل مکانی کرنے والے بس نقل مکانی کرنے والے پرندے ہوتے ہیں انھیں کچھ اور نام دینا مناسب نہ ہوگا۔

ماہ اکتوبر اور مارچ کے دوران شمال مشرقی مانسون کے فوراً بعد اس جھیل میں پرندوں کی سرگرمیاں عروج پر تھیں۔ موسم گرما کے آخر ہوتے ہوتے جھیل سوکھ گئی۔ ایک دم خشک، جون کے آخر تک تو جھیل کی تہہ کی مٹی خشک ہوکر بڑی بڑی دراروں والی مہیب شکل کا فرش بن گئی۔ جنوب مغربی مانسون کی ہلکی بارش سے صرف جھیل کی تہہ میں ہلکی سی نمی آئی اور بس۔ جھیل کو کناروں تک بھرنے کے لیے تو اکتوبر اور نومبر کی موسلا دھار بارش درکار ہوتی ہے۔ آغاز میں پانی مٹی آمیز بلکہ کیچڑ آمیز تھا پھر چند روز کے وقفے کے بعد اس پانی میں زندگی کے آثار دکھائی دینے لگے۔

معجزاتی طور پر اب پانی میں مینڈک، مچھلی اور دیگر آبی جانور دکھائی دینے لگے۔ آبی نباتات نے بھی تیزی سے فروغ پایا۔ اس تبدیلی اور خوراک کی فراوانی سے مستفید ہونے کے لیے گرد و نواح کی مختلف اقسام کی آبی چڑیاں یہاں آگئیں۔

تالاب میں رہنے والے بگلے، دودھ جیسے سفید رنگ کے پرندے باقاعدہ اور بے حد منظّم جھنڈ میں چلنے والی خصوصی جنگلی مرغیاں، پانی میں غوطے لگانے والی جل مرغیاں اور اس طرح کے دیگر پرندے جھیل میں آ گئے۔

جب لمبی دوری طے کر کے آنے والے پرندوں کی آمد ہونے لگی تو جھیل پر جا کر ان پرندوں کا نظارہ بڑا دلکش و خوش گوار مشغلہ بن گیا۔ کسی شرمیلی چڑیا کا باقاعدہ طور پر پتہ لگانا اس کے پیچھے جانا ایک بے حد دلچسپ مشغلہ تھا۔ اس سے تجربہ بھی بڑھتا تھا۔ اکثر یہ معلوم کرنے کی جستجو ہوتی کہ آیا یہ پرندہ نیلے گلے والا مگس خور ہے یا سرخ سینے والا مگس خور؟ کسی اداس شام ہلکی پھوار میں کسی خاص پرندے کا پیچھا کرنا خاص طور سے ایسے پرندے کی جستجو جو کہ اپنے کو جھاڑی میں پوشیدہ کرنے کا آرزومند ہو، ایک بے حد دلچسپ مشغلہ ہوتا۔ پاؤں کے نیچے پھسلن والی کیچڑ اور اوپر سے ہلکی بارش کی رم جھم سے ایسا لگتا کہ فطرت اپنے رازہائے سربستہ کھول رہی ہے اور زیر لب مسکرا رہی ہے۔

ماہ جنوری اور فروری میں اس جھیل کے کنارے ٹہلنا خصوصاً صبح کے وقت ایک خوش گوار تجربہ ہوا کرتا تھا۔ اس وقت پتیوں پر پڑی شبنم نرم بھاپ بن کر اڑنے لگتی اور سورج کی روشنی ان پتیوں سے چھن چھن کر نیچے آتی۔ فضا میں بے شمار پرندوں کی آوازیں عجب سی نغمگی بھر دیتیں۔ کہیں سے بارہ سنگھے کی آواز آتی اور اس سے ماحول میں عجب سی کشش پیدا ہو جاتی۔ جنگل میں اٹھنے والا ہر قدم کوئی نہ کوئی نئی بات سکھاتا، ہمارے علم میں کچھ نہ کچھ اضافہ ضرور کرتا۔

مارچ اور اپریل کے مہینے میں جھیل کے اندر پانی کی سطح سورج کی تپش سے تیزی سے گھٹنے لگتی۔ مچھلیاں چھوٹے چھوٹے گڈھوں میں قید ہو کر رہ جاتیں، پانی روز بروز گھٹتا جاتا۔ بگلے

اور سارس اور اس طرح کے دیگر پرندے ان دنوں مزے سے مچھلیوں کا شکار کرتے اور دن بھر کیچڑ میں ان کی تلاش میں لگے رہتے اور پانی کے اندر چھپے سانپ ان کا شکار اندر سے کر لیتے۔

مئی کے آتے آتے یہ وسیع جھیل سمٹ کر بہت معمولی سے چھوٹے سے تالاب کی شکل لے لیتی۔ چند ہفتے قبل، جھیل میں جو سرگرمی ہوا کرتی، اب اس کا کہیں پتہ بھی نہ ملتا اور نقل مکانی کر کے آنے والے پرندے بھی اپنے وطن کی جانب پرواز کر جاتے۔

خشک گھونگھے اور اور مچھلیوں کی ہڈیاں جھیل کی تہہ میں دور سے چمکتی نظر آتیں اور اس بات کا احساس ہوتا کہ یہ مقام کبھی ان جانداروں سے باقاعدہ طور پر آباد رہا ہوگا۔ کبھی یہاں ان کی بہتات رہی ہوگی۔ خالی جھیل دوبارہ زندگی پانے کے لیے مانسون کی منتظر رہتی اور یہ سلسلہ سال بہ سال جاری رہتا۔

اب گذشتہ چند برسوں سے جھیل میں مگرمچھوں کا ایک جوڑا بھی آ گیا تھا۔ درحقیقت یہ نسلاً جنگلی نہ تھے بلکہ ہوا یوں کہ وہ کم عمری میں ہی نزدیکی اسنیک پارک سے نکل بھاگے تھے۔ ایک مرتبہ زبردست بارش میں وہ اپنے پنجرے سے کسی طرح نکل آئے تھے اور پھر پانی کے تیز بہاؤ کے ساتھ جھیل تک پہنچ گئے تھے۔

اسنیک پارک اور محکمۂ جنگلات نے ان مگرمچھوں کو پکڑنے کی بار بار کوششیں کیں تاہم کوئی نتیجہ نہ نکلا کیونکہ جھیل میں انھیں پکڑنا ازحد دشوار تھا۔ اب ان میں سے ایک مگرمچھ کی لمبائی 8 فٹ تک پہنچ گئی تھی، دوسرا ابھی چھ فٹ کا ہی تھا۔ اپنی اس جسامت کے باوجود وہ بڑی خاموش زندگی گزارتے تھے۔ انھوں نے کبھی کسی گاؤں والے پر حملہ نہ کیا، اگرچہ گاؤں والے باقاعدگی سے جھیل پر نہاتے دھوتے تھے۔

دراصل یہ گھڑیال دکھائی ہی بہت کم دیتے تھے۔ تین برسوں کی مدت میں، میں نے ان کو صرف تین یا چار مرتبہ ہی دیکھا ہوگا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ مچھلیوں پر ہی گزارا کرتے تھے، چھوٹے موٹے جانور پکڑ لیا کرتے تھے۔ ہوسکتا ہے کبھی کبھی کوئی ہرن وغیرہ بھی مار لیتے ہوں۔

یہ بات ایک پہیلی تھی آخر یہ مگرمچھ گرمیوں کے زمانے میں جب جھیل خشک ہو جایا کرتی تھی کہاں چلے جاتے تھے۔ آس پاس تو صرف پانی کے نام پر گندے پانی کے گڈھے تھے جو کہ جھیل سے جڑے بھی نہ تھے۔ کیا یہ گھڑیال ان گندے گڈھوں سے غذا حاصل کر لیتے تھے؟ ان گڈھوں تک پہنچنے کے لیے وہ جنگل سے کیسے گزرتے تھے، یا یہ پیڑ پودوں کے جھنڈ میں موسم گرما کے دوران گہری نیند میں چلے جایا کرتے تھے؟

ایک پہیلی یہ تھی کہ مانسون کی بارش کے ساتھ ہی جھیل اس قدر تیزی سے مچھلیوں سے کیسے بھر جایا کرتی تھی۔ جہاں تک ہماری جانکاری ہے یہ مچھلیاں علاقے کی کسی دوسری جھیل سے بھی نہیں آسکتی تھیں۔ کیا اس کا مطلب یہ تھا کہ مچھلیوں کے انڈے گرمیوں میں محفوظ رہتے تھے اور تازہ پانی میں ان کی افزائش ہو جایا کرتی تھی۔ ایسے سوالات سیر سے لوٹتے ہوئے بات چیت کا موضوع ہوتے۔ اگرچہ ہم تھکے ہوتے تاہم جو کچھ تجربات ہمیں ہوئے ہم ان سے خوش بھی ہوتے تھے۔

(جاری)

■

ماخذ: شہر میں ایک جنگل، **مصنف:** کمارن ست سیوم، **مترجم:** عباس آصف، **مصور:** بی جی ورما، **ناشران:** چلڈرن بک ٹرسٹ، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، بچوں کا ادبی ٹرسٹ

طٰہٰ نسیم

فاطمہ الفہری

مسلم خواتین نے ترویج علم کے لیے زبردست کوششیں کی ہیں۔ انھوں نے اس کام کے لیے اپنی تمام دولت تک صرف کردی۔ دنیا کی سب سے پرانی یونیورسٹی جامعہ القرویین کو قائم کرنے والی ایک خاتون فاطمہ الفہری پر عالم اسلام جتنا ناز کرے کم ہے۔ فاطمہ الفہری نے 859ء میں زر کثیر خرچ کر کے تیونس کے علاقے فیض میں یہ یونیورسٹی ایک مسجد کے ساتھ قائم کی تھی۔ اس دور میں اس تعلیم گاہ کی شہرت کا یہ عالم تھا کہ دور دور سے طلبا یہاں حصول علم کے لیے آتے تھے۔ یہاں طعام و قیام کا مفت انتظام تھا اور اپنے تعلیمی معیار کے لیے یہ یونیورسٹی اسلامی دنیا میں خاص مقام رکھتی تھی۔

اس یونیورسٹی کی سب سے بڑی دین یہ ہے کہ اس کے ذریعے عربی گنتی سے اہل یورپ متعارف ہوئے۔ یہاں اسلامیات کے ساتھ ساتھ عربی ادب، سائنس اور علم ہیئت کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ فاطمہ الفہری کا تعلق ایک تعلیم یافتہ اور مال دار خاندان سے تھا۔ ان کے والد تیونس سے فیض (مراکش) ہجرت کر کے آئے تھے۔ ان کی پرورش ایسے ماحول میں ہوئی تھی جہاں مختلف علوم پر مباحثے ہوتے تھے اور بڑے بڑے اہل علم ان کے والد کے پاس آتے تھے۔ فاطمہ نے خود اسلامی فقہ اور حدیث کی تعلیم حاصل کی تھی۔ انھیں اپنے والد سے کثیر دولت ورثے میں ملی اور انھوں نے اس پیسے سے قرابین مسجد اور مدرسہ قائم کیا۔

گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ اور یونیسکو نے اس یونیورسٹی کو دنیا کی سب سے قدیم یونیورسٹی قرار دیا ہے جہاں سے طلبا آج بھی ڈگری حاصل کر رہے ہیں۔ 1963 سے یونیورسٹی حکومت مراکش کے زیر انتظام ہے۔ یہاں عربی ادب، اسلامی فقہ اور قانون کی تعلیم دی جاتی ہے۔ یہاں فقہ مالکی کی تعلیم حاصل کرنے دور دور سے طلبا آتے ہیں۔ 2012ء میں یہاں آٹھ ہزار طلبا پڑھ رہے تھے۔ جس شہر سے فاطمہ الفہری کے والد ہجرت کر کے آئے تھے اس کا نام قیروان تھا۔ اسی مناسبت سے یونیورسٹی کا نام القرویین پڑا۔ فاطمہ کے والد محمد الفہری نے اپنی دونوں بیٹیوں کو اعلیٰ درجے کی تعلیم دلائی۔ اس دور میں فیض ادریسی حکومت کا دارالسلطنت تھا۔ اس یونیورسٹی سے ابن خلدون، محمد الادریسی، محمد تقی الدین الہلالی، عبداللہ الغمری، امام البنانی، عبدالکریم الخطابی، علّال الفاسی اور فاطمہ الخیاج جیسے مشہور لوگوں نے تعلیم حاصل کی۔

■

Taha Naseem
Pahari Bhojla, Turkaman Gate
Delhi - 110006

محمد علیم اسماعیل

بدلہ

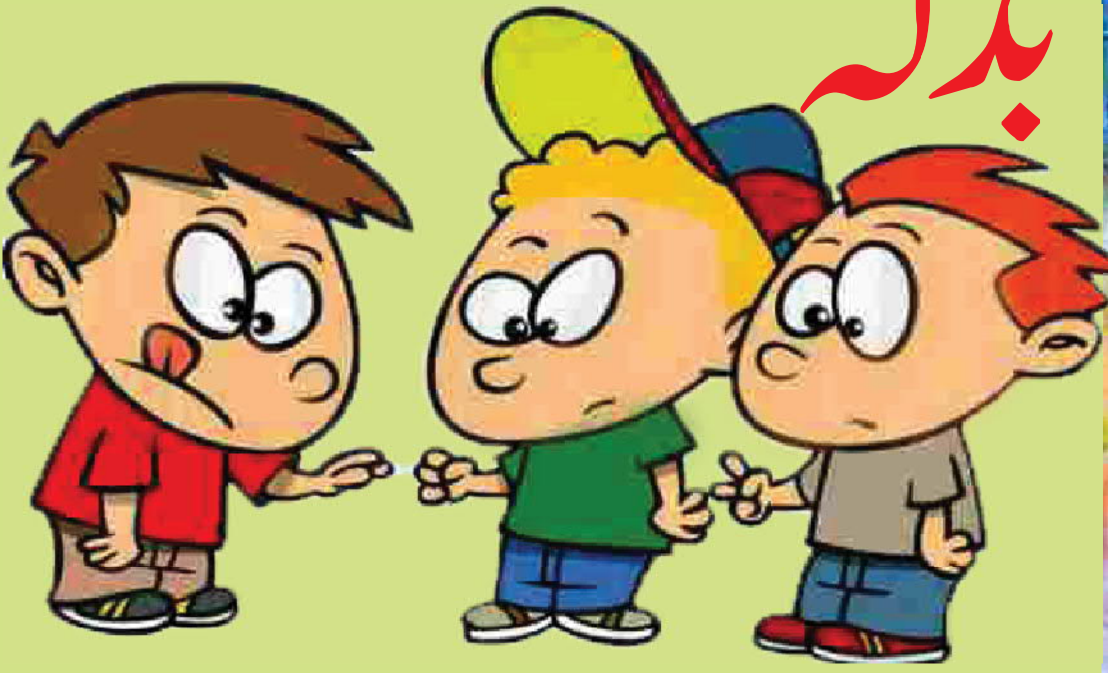

اسکول کے وقفے میں عفان نے کھانا کھانے کے لیے اپنا ڈبہ کھولا لیکن ڈبے سے کھانا غائب تھا، کمرہ جماعت میں قلم اور کاپی نکالنے کے لیے اس نے اپنا بستہ کھولا لیکن بستے میں تمام کتابیں کاپیاں الٹ پلٹ کر کے رکھی ہوئی تھیں اور کمپاس باکس سے قلم غائب تھا۔عفان سمجھ گیا کہ یہ خرم کی شرارت ہے۔عفان بہت پریشان ہو گیا۔عفان کو پریشان کرنے کے لیے خرم اس طرح کی حرکت کرنے لگا تھا۔کچھ اسی قسم کا سلوک عفان کو ایک عرصے سے برداشت کرنا پڑ رہا تھا۔ چند روز پہلے کی بات ہے کہ خرم اسی طرح سے مشیر کو پریشان کر رہا تھا اور عفان نے خرم کی شکایت صدر مدرس سے کی تھی۔اس کے بعد خرم نے عفان کو ہی پریشان کرنا شروع کر دیا تھا۔مشیر نے عفان سے کہا ”دوست میری وجہ سے تمھیں پریشانی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔خرم کے ذریعے کی گئی یہ بدمعاشی میرا دل دکھا دیتی ہے۔تم ہمیشہ سمجھداری سے کام لیتے ہوئے مسکرا کر خرم کی گھٹیا حرکتیں برداشت کرتے ہو لیکن برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ پانی سر سے اونچا ہو چکا ہے۔اب پھر سے اس کی شکایت کرنی پڑے گی۔“ عفان نے مشیر سے کہا ”اب ہم اس کی شکایت نہیں کریں گے، اب ہم خود اس کو سمجھائیں گے، کچھ بچے ایسے ہوتے ہیں جن کی شکایت کرنے پر ان کے مزاج میں اور بھی ٹیڑھا پن پیدا ہو جاتا ہے۔ایسے بچوں کو محبت سے سمجھایا جا سکتا ہے۔اللہ تعالی ارشاد فرماتا ہے ”تم برائی کا بدلہ اچھائی کے ساتھ دو۔“ اس عمل سے تمہارا جانی دشمن تمہارا جگری یار بن جائے گا۔

خرم کو اکیلا پا کر عفان اس کے پاس گیا اور محبت بھرے

لہجے میں بولا ’’دوست مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔‘‘ خرم نے سخت لہجے میں کہا ’’مجھے آپ سے کوئی بات نہیں کرنی۔‘‘ عفان نے کہا ’’آپ ایک بار میری بات سن لیں اس کے بعد آپ جو چاہے کریں۔‘‘ خرم نے کہا ’’ٹھیک ہے جو کہنا ہے جلدی کہو میرے پاس وقت نہیں ہے۔‘‘ عفان نے کہا ’’بھائی آپ مجھ سے کیوں ناراض رہتے ہو؟ ہم ایک ہی جماعت میں پڑھتے ہیں پھر کیوں ہمارے درمیان اتنی تلخیاں ہیں؟ آپ کے سخت برتاؤ اور طنز سے میری دل آزاری ہوتی ہے۔ بھائی ہم اسکول میں پڑھنے آتے ہیں اور یہ پڑھائی کا وقت ہم فضول کی نوک جھوک میں کیوں برباد کر رہے ہیں؟ انسان کی زندگی بہت چھوٹی ہے۔اس لیے ضروری ہے کہ ہم ایک دوسرے کے ساتھ محبت و ہمدردی سے رہیں۔ اگر جانے انجانے میں مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہو تو اس کے لیے میں آپ سے معافی مانگتا ہوں۔‘‘ عفان کی باتوں میں نرمی، مٹھاس اور غضب کی کشش تھی۔اس کی محبت بھری باتوں نے خرم پر اثر کیا اور اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ ’’یار بہت بڑی بڑی باتیں کرنے لگا ہے، تو کب سے اتنا بڑا ہو گیا۔‘‘ خرم نے عفان سے کہا اور اس کی آنکھوں سے آنسو جھلک پڑے۔ عفان نے حیرت سے کہا ’’خرم تمہاری آنکھوں میں آنسو!‘‘ خرم نے کہا ’’نہیں تو کس کی آنکھوں میں؟‘‘ عفان نے کہا ’’آپ کی آنکھوں میں جناب اور کس کی۔‘‘ اب لاکھ ضبط کے بعد بھی خرم آنسو نہ روک سکا۔اس نے روتے ہوئے عفان کو اپنے گلے لگا لیا اور کہا ’’یار عفان مجھے معاف کر دے۔‘‘

■

Mohd Alim Ismail
Nandura (443404)
Dist-Buldana (Maharashtra)

سائنسی معلومات

- لوہے کو زنگ لگنے کا مطلب آئرن آکسائیڈ بننا ہے اس کا فارمولا Fe_2O_3...
- کیلشیم کاربونیٹ کا فارمولا $Ca[OH]_3$...
- نمک ہماری غذا کا اہم جز ہے۔ اس کا کیمیائی فارمولا Nacl ہے۔
- بلب کو روشن کرنے کے لیے برقی توانائی استعمال ہوتی ہے.....
- مائیکروفون آلہ برقی توانائی کو صوتی توانائی میں تبدیل کرتا ہے۔
- میتھین پہلی قسم کی قدرتی گیس ہے.....
- ہمارے نظام شمسی میں توانائی کا واحد ذریعہ سورج ہے...

■

Aisha Meer Ashfaque Ali
Fatima Girls Urdu High School
Begum Pura, Aurangabad (Maharashtra)

جاں نثار معین

بیگم حضرت محل

بیگم حضرت محل کا اصل نام افتخار النساء تھا۔ اودھ کے آخری نواب واجد علی شاہ کی بیگم تھیں۔ وہ بہادر اور جانباز تھیں۔ آزادی کے لیے اپنا تخت و تاج، اولاد سب کچھ قربان کردیا تھا۔ جنگ آزادی میں شامل ہونے والی پہلی خاتون تھیں۔ ان کا تعلق فیض آباد کے غریب گھرانے سے تھا۔ ان کے آباواجداد ایران سے آکر اودھ میں بس گئے تھے۔ نواب نے شاہی خاندان میں ملکہ کا درجہ دیا۔ 1856 میں نواب سے مشورہ کر کے لکھنؤ میں انگریزوں کے خلاف جنگ کا منصوبہ تیار کرتی رہیں۔ کانپور تک جب انگریزوں کے خلاف بغاوت کا اعلان ہوگیا، تو آپ نے انگریزوں کے خلاف تقاریر کیں اپنے فرزند کو بھی ہندوستانیوں میں جوش بھرنے کے لیے تقریر کرنے کا حکم دیا۔

انگریز واجد علی شاہ کو جلا وطن کر کے کلکتہ بھیجا تو بیگم نے پہلی جنگ آزادی کی ریاست کی کمان فوجیوں کی مدد سے سنبھال لی اور محل سے ہی پالیسیاں بناتی رہیں۔ اور میدانِ جنگ میں عملی طور پر حصہ لیا۔ تو انگریز ہندستان سے بھاگنے پر مجبور ہوگئے۔ ان کے خلاف منظّم کوششوں سے ہی اودھ کا نظام حاصل کیا۔ حضرت محل نے اپنے بیٹے برجیس قدر کو ولی عہد بنایا لیکن بہت جلد برطانوی فوج نے لکھنو پر دوبارہ قبضہ کر کے تمام حقوق سلب کر لیے۔ بیگم نے برطانوی حکومت کی طرف سے عطا کردہ کسی بھی قسم کی عنایات کو قبول نہ کر کے غیرت وطنی اور خودداری کا ثبوت دیا ہے۔ ان کی فوج جب پسپا ہوئی تو انہوں نے حوصلہ نہیں ہارا، بلکہ دیگر مقامات پر فوج کو منظّم کیا۔ اور سر ہینری لارنس کا محاصرہ ریزیڈنسی میں کیا۔ اور اسے قتل کر کے لکھنؤ میں اپنی حکومت قائم کرلی۔ اس کے بعد جنرل ہیولاک انگریزی فوج کی مدد کے لیے آیا، لیکن اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوسکا اور لکھنوانگریزوں کی قتل گاہ بن گیا۔ جس ریزیڈنسی انگریزوں کے قبضے سے نکل گیا تو شہروالوں نے

اطمینان کی سانس لی۔حضرت محل نے مجاہدوں کو دعائیں دیں، جب انگریزوں نے دوبارہ لکھنو پر حملہ کیا تو حالات اتنے بگڑ گئے کہ حضرت محل کو قیصر باغ چھوڑ کر اپنے وفاداروں کے ساتھ ضلع بہرائچ کے بونڈی کے راجا کے یہاں کچھ دن قیام کرنا پڑا۔اس کے بعد وہ نیپال چلی گئیں اور باقی زندگی وہیں گزار دی۔

غدر کے دوران صوبہ اودھ میں ان کی نا قابلِ فراموش جدوجہد سنہرے الفاظ میں درج رہے گی۔انھوں نے برطانوی سامراج ویسٹ انڈیا کمپنی سے لوہا لیا۔آخری سانس تک تقریباً بیس سال انگریزوں کی مخالفت کی۔1856 میں برطانوی حکومت نے واجد علی شاہ کو جلا وطن کر کے کلکتے بھیج دیا تو حضرت محل نے حکومت سنبھا لی۔لکھنو چھوڑنے کے بعد نیپال میں پناہ لی اور وہیں 1879 میں ان کی وفات ہوئی تو کاٹھ منڈو کی جامع مسجد کے قبرستان میں گمنام طور پر ان کو دفن کر دیا گیا۔15 اگست 1962 میں ان کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ریاستی حکومت نے وکٹوریہ پارک میں ان کی یاد میں سنگ مرمر کا مقبرہ تعمیر کرواکر بیگم حضرت محل پارک سے موسوم کیا۔جدوجہد سے مزین ان کی حیات اس امر کا ثبوت ہے کہ عورت لاچار یا بے بس نہیں ہے۔بلکہ وہ تو مردوں کے کندھے سے کندھا ملا کر چل سکتی ہے۔

برطانوی سامراج ویسٹ انڈیا کمپنی سے جنگ چھیڑ کر موت (1879) تک انگریزوں سے لڑتی رہیں۔جبکہ انگریز بیگم کو دولت اور عہدوں کا لالچ دیتے تھے۔لیکن انھوں نے انکار کر دیا اور سخت حالات میں بھی اپنی فوج کے حوصلے بڑھاتی رہیں۔ٹیپو سلطان کے بعد 1857 میں مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کی قیادت میں لڑی گئی پہلی جنگ آزادی میں ہزاروں مسلمان شہید ہوئے۔حضرت محل نے تقریباً چودہ مہینوں تک انگریزوں سے مقابلہ کیا۔خواتین مجاہدین میں بیگم عزیزون، بیگم حبیبہ، بیگم رحیمہ اور اصغری بیگم وغیرہ شہید ہوئیں۔اس کے بعد انگریزوں نے 27 ہزار سے زیادہ مسلمانوں کو شہید کر دیا۔باقی مجاہدین کو زندہ جلا دیا، پھانسیوں پر چڑھایا اور توپوں سے اڑا دیا۔

انگریزوں کی عیاری، مکاری اور چالاکیوں سے بھی حضرت محل بخوبی واقف تھیں۔کیوں کہ موقع محل کے اعتبار سے اپنی حکمت کا استعمال کرتی تھیں۔وہ دوراندیش تھیں۔بیگم کے فیصلوں کو سبھی قبول کر لیتے تھے، بلکہ ان کے ہاتھوں بڑے بڑے عہدوں پر قابل عہدیداروں کا تقرر کرنے کی بھی ستائش کی جاتی تھی۔دشواریاں اور محدود وسائل کے باوجود عوام الناس کی حوصلہ افزائی کرتی رہیں۔حتی کہ انھوں نے خواتین کی ایک ایسی فوج تیار کی جس میں چند ماہر خواتین کو جاسوسی کے کام دیے گئے۔ان فوجی خواتین نے محل کی حفاظت کے لیے اپنی جانوں کی پروانہیں کی۔انگریزی فوج مسلسل ریزی ڈینسی سے اپنے ساتھیوں کو آزاد کروانے کے لیے کوشش کر رہی تھی۔شدید مخالفت کے دوران انگریزوں کو لکھنو میں فوج بھیجنا مشکل ہو گیا تھا۔دوسری جانب ریزی ڈینسی پر حملے کیے جا رہے تھے۔ایسے مشکل حالات میں حضرت محل لکھنو کے مختلف علاقوں میں تن تنہا فوجیوں کے حوصلے کو مضبوط کرتی رہیں۔

دہلی پر انگریز قبضہ کر چکے تھے۔بہادر شاہ ظفر کے قید ہوتے ہی انقلابیوں کے حوصلے ٹوٹنے لگے، تو حضرت محل نے قیصر باغ کے دروازے پر تالے لٹکوا دیے۔برطانوی فوج تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی۔بیگم نے اپنے فوجیوں میں جوش بھرتے ہوئے کہا ''اب سب کچھ قربان کرنے کا وقت آ گیا

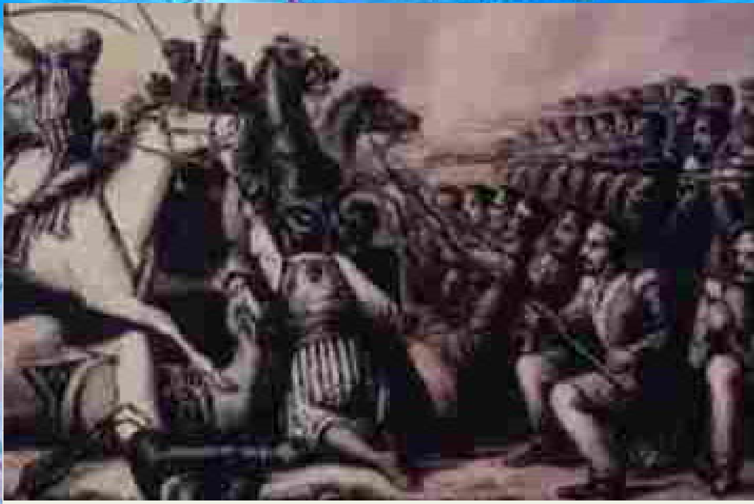

ہے۔'' جب کہ ہیولاک عالم باغ تک پہنچ چکا تھا، عوام اور محل کے سپاہی شہر کے محافظ بن گئے۔ موسلا دھار بارش میں دونوں جانب سے تیروں کی بوچھار تھی۔ تو حضرت محل بڑی بے چینی کے عالم میں گھوم کر سرداروں میں جوش پیدا کر رہی تھیں۔ جس سے انقلابیوں کو نئی توانائی ملی۔ اس ہمت افزائی کی وجہ سے سب کچھ فراموش کر کے بھوکے پیاسے انقلابی اپنے وطن کے لیے مرمٹنے کو تیار ہو گئے۔ اس کے باوجود چند ضمیر فروشوں کی غداریوں کی بنا پر فرنگیوں نے اپنے ساتھیوں کو ریزیڈنسی سے آزاد کرا لیا۔ اور لکھنو پر انگریزوں کا تسلط ہو گیا۔ انہیں کبھی یہ احساس نہیں ہوا کہ وہ کسی خاتون کی سربراہی میں جدوجہد کر رہے تھے۔ انہیں اپنی قائد پر بے پناہ اعتماد تھا۔ جسے حضرت محل نے کمزور نہیں ہونے دیا۔ جب باغیوں کا سردار دلپت سنگھ محل میں پہنچا تو انھوں نے حضرت محل سے کہا 'بیگم حضور' آپ سے ایک التجا کرنے آیا ہوں۔' جب انھوں نے دریافت کیا تو اس نے کہا '' آپ اپنے فرنگی قیدیوں کو مجھے سونپ دیجیے '' میں ان میں سے ایک ایک کا ہاتھ پیر کاٹ کر انگریزوں کی چھاؤنی میں بھیجوں گا۔' اس پر حضرت محل کے لہجہ میں سختی آگئی' انھوں نے کہا ''نہیں ہرگز نہیں' میں قیدیوں کی ساتھ ایسا سلوک نہ تو خود کر سکتی ہیں اور نہ کسی کو اس کی اجازت دے سکتی ہوں، قیدیوں پر ظلم کرنے کی روایت ہم میں نہیں ہے۔ ہمارے جتنے بھی فرنگی قیدی اور ان کی عورتیں ہیں' ان پر کبھی ظلم نہیں ہوگا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے حضرت محل کس قدر انصاف پسند تھیں۔

اتنی باصلاحیت انصاف پسند مجاہدہ کے لیے تاریخ کے ماہرین نے لکھا ہے کہ وہ صنف نازک ہونے کے باوجود مردوں کی طرح انگریزوں سے مقابلہ کرتی رہیں۔ آج بھی ہمارے معاشرے میں بہت سی خواتین حضرت محل بن سکتی ہیں اگر انہیں وہ مواقع ملیں۔ آج اکثر لوگ جھانسی کی رانی یا رضیہ سلطانہ سے تو واقف ہیں لیکن حضرت محل کو بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ بعض مؤرخین (تاریخ لکھنے والوں) کے خیال میں بیگم کو دیگر حکمرانوں کی مدد ملتی یا دھوکہ نہیں دیا جاتا تو وہ انگریزوں سے ملک کو ضرور آزاد کرا لیتیں۔ رانی جھانسی اور بیگم حضرت محل کے نام انگریزوں کے لیے بھیانک خواب کی طرح تھے۔ جنگ آزادی کی تاریخ حضرت محل کے تذکرے کے بغیر ادھوری ہے۔

■

Jan Nisar Moin
Senior Research Scholar,
Department of Women Education
Maulana Azad National Urdu University
Gachibowli-500032, Hyderabad (Telangana)

آپ کا دماغ کتنا تیز ہے؟

دوستو! یہ دونوں تصویریں دیکھنے میں تو ایک جیسی لگتی ہیں لیکن تصویروں کی نقل بنانے والے سے ایک دو نہیں بلکہ دس غلطیاں ہوگئی ہیں۔ کیا آپ ان غلطیوں کو تلاش کر سکتے ہیں؟ 10 منٹ میں اگر آپ نے تمام غلطیاں تلاش کر لیں تو سمجھیے کہ واقعی آپ کا دماغ بہت تیز ہے۔

■ جوابات اسی شمارے میں تلاش کریں

ہنسی کے غبارے

ایک بے حد موٹی خاتون اپنے موٹاپے کا علاج کرانے اپنے خاندانی معالج کے پاس پہنچی۔ ڈاکٹر نے معائنہ کے بعد کہا ’’آپ کا جسم خطرناک حد تک پھیل گیا ہے، چربی بہت زیادہ بڑھ گئی ہے اور اِس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ آپ کھانے پینے میں احتیاط نہیں کرتیں۔ شہر کی تمام تقریبات میں آپ شریک ہوتی ہیں اور کھانے پینے کا کوئی موقع ہاتھ ـــ‘‘

’’ڈاکٹر صاحب!‘‘ خاتون نے اس کی بات کاٹ کر کہا ’’کیا آپ اپنے مریضوں کی خاطر مدارات نہیں کرتے؟ میرا مطلب ہے کوئی چائے وائے، بسکٹ، پیسٹریاں وغیرہ نہیں منگواتےـــ؟‘‘

ایک مسافر بغیر ٹکٹ سفر کر رہا تھا۔ ٹکٹ چیکر نے اس سے کہا ’’اے مسٹر! ٹکٹ دکھاؤ۔‘‘

مسافر ’’آپ کو یہ کام کرتے ہوئے کتنا عرصہ ہو گیا ہے؟‘‘

ٹکٹ چیکر: ’’جناب دس سال۔‘‘

مسافر ’’تو آپ نے دس سالوں میں آج تک ٹکٹ ہی نہیں دیکھا؟‘‘

ایک شخص نے دوسرے سے کہا ’’میں تمھیں پچاس روپے دوں اور کہوں کہ تم دریا میں چھلانگ لگاؤ تو کیا تم ایسا کرنے پر تیار ہو جاؤ گے ‘‘

دوسرے شخص نے کہا ’’ہاں، بالکل تیار ہو جاؤں گا۔‘‘

پہلا شخص ’’کیا تم پاگل ہو کہ چھلانگ لگا دو گے؟‘‘

دوسرا شخص ’’پاگل میں نہیں آپ ہیں، کیونکہ مجھے تیرنا آتا ہے۔‘‘

گاہک ’’اِس ٹائی کی کیا قیمت ہے؟‘‘

دکان دار ’’پچاس روپے‘‘

گاہک ’’مگر پچاس روپے میں تو جوتوں کا اچھا جوڑا مل جاتا ہے‘‘

دکان دار ’’تو پھر جوتوں کا جوڑا گلے میں لٹکا لیں۔‘‘

نوازش (نوکر سے) ’’میں نے تمھیں کہا تھا کہ چاول چوزے کو کھلا دینا، تم بلی کو کیوں کھلا رہے ہو؟

نوکر ’’جناب! چوزہ بلی کے پیٹ میں ہے۔‘‘

ایک افسر نے کلرک کو ڈانٹتے ہوئے پوچھا ’’کیا تم نے لوگوں سے کہا ہے کہ میں احمق ہوں؟‘‘

کلرک نے خوف سے لرزتے ہوئے کہا ’’ہرگز نہیں جناب، یہ جھوٹ ہے، لوگ تو پہلے ہی سے یہ بات جانتے ہیں۔‘‘

عفیفہ سحر

سچی خوشی

اسکول کھل چکا تھا۔ عرفان کو نئی کتابیں خریدنی تھیں۔ اس
لیے اس نے آج شام ممی سے سو روپے کا نوٹ لے کر جیب میں
رکھا اور روانہ ہوا۔ مین روڈ پر پہنچ کر اس نے روڈ پار کرنے کے
لیے جلدی سے دائیں بائیں نظر دوڑائی اور کوئی گاڑی نہ دیکھ کر
جلدی جلدی روڈ پار کرنے لگا تبھی ایک بوڑھے سے ٹکرا گیا اور
بوڑھے کے ہاتھ میں موجود تھیلی گر پڑی۔ بوڑھا تھیلی اٹھانے
کے لیے جھکا تبھی عرفان نے لپک کر تھیلی اٹھا لی اور بوڑھے سے
معافی مانگتے ہوئے بولا ''معاف کرنا دادا جان! میں نے آپ کو
دیکھا نہیں، آئی ایم سوری، آئی ایم ریئلی سوری۔'' آپ کو کہاں
جانا ہے۔ چلیے میں آپ کو روڈ کراس کرا دیتا ہوں۔ مجھے تو فرید
بک ڈپو کے نزدیک جانا ہے۔ اس نے معافی مانگتے ہوئے
بوڑھے سے پوچھا اور ساتھ ہی اپنا مقصد بھی بیان کر دیا۔ ''مجھے
بک ڈپو کے ساتھ والی شاپ میں سبزی لینے جانا ہے۔'' بوڑھے
نے جواب دیا۔ ''ٹھیک ہے میں آپ کو وہاں چھوڑ دیتا ہوں۔
عرفان نے بوڑھے کا ہاتھ پکڑ کر سبزی والی شاپ پر چھوڑ کر فرید
بک ڈپو آ گیا۔ ''تمھیں کیا چاہیے بیٹا؟'' دکاندار نے پوچھا۔
تبھی اچانک عرفان کو یاد آیا جلدی میں وہ کتابوں کی لسٹ گھر پر
ہی بھول آیا ہے لیکن اسے جلد ہی کتابوں کے نام یاد آ گئے اور
اس نے دکاندار سے کہا کہ ''مجھے اردو، میتھس، سائنس اور
ہسٹری کی کتابیں چاہئیں۔'' دکاندار سے کتابیں لے کر اس نے
دکاندار کی طرف سو روپے کا نوٹ بڑھایا اور دکاندار نے اسے
چالیس روپے لوٹائے۔ ''انکل! کل کتابوں کا ریٹ کیا ہے؟''
''ستر روپے۔'' عرفان کے پوچھنے پر دکاندار نے بتایا۔ عرفان
نے روپے گنے بغیر جیب میں رکھے اور گھر لوٹ آیا۔ گھر واپس
ہو کر اس نے جب کل قیمت کو جمع کر کے حساب لگایا تو اس نے
دیکھا کہ دکاندار نے اسے 10 روپے کا نوٹ زیادہ دے دیا ہے۔

اس نے سوچا کہ کل صبح اسکول جاتے وقت دے دوں گا اور لنچ
کرنے بیٹھ گیا لیکن وہ اپنے ضمیر کو مطمئن نہ کر سکا۔ اس لیے کھانا
چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ دس روپے جیب میں رکھے اور جلدی سے چل
پڑا۔ ممی نے اسے یوں باہر جاتے ہوئے حیرت سے دیکھا اور پوچھا
''عرفان! کہاں جا رہے ہو بیٹا!'' ''ممی صرف دو منٹ میں آ رہا
ہوں۔'' عرفان کو دکاندار نے بہت شاباشی دی۔ جب عرفان نے
اس کو دس روپے لوٹائے۔ وہ گھر لوٹ آیا تو اسے ایسا لگا جیسے اس
کے سینے پر دھرا بھاری بوجھ ہٹ چکا ہو۔ اس کا دل ہلکا پھلکا
ہو چکا تھا۔ اس نے ممی کو جب ساری بات بتائی تو انھوں نے
اسے شاباشی دی اور بولیں ''بیٹا اسی کا نام سچی خوشی ہے۔ یاد رکھو،
ہمیشہ ایمانداری سے کام کرنا۔ ان شاء اللہ تم کامیاب ہو گے اور
اللہ تعالیٰ تمھاری مدد کرے گا۔'' ''ان شاء اللہ میں کوشش کرتا رہوں
گا۔'' عرفان نے ممی کی بات سن کر کہا اور ان کے گلے لگ گیا۔

■

Afifa Sahar
D/o Mohd Ainul Haque
Class: VIII, Azad Urdu High School
Nandura (Maharashtra)

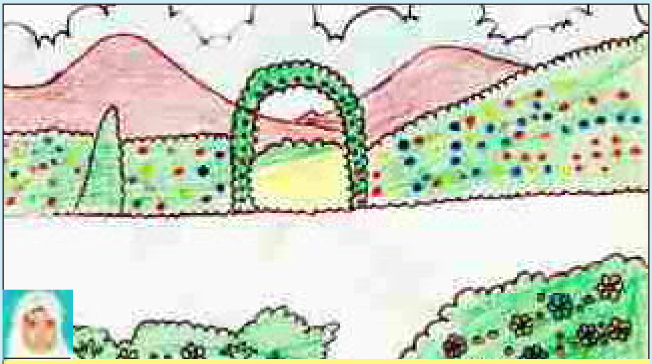

رینہ کثر بنت محمد خاں، درجہ چہارم، نگر پریشد، اردو گرلز اسکول، جل گاؤں، مہاراشٹر

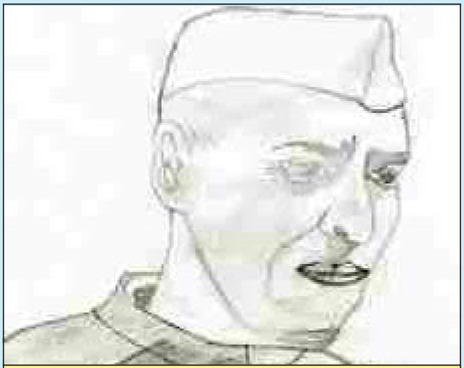

صوفیہ مجددی، درجہ ہشتم بی، سنوے سینئر سیکنڈری اسکول، رامپور، یوپی

اے ایس شیخ، ڈی ایس ایم کالج، جنتور، ضلع پربھنی، مہاراشٹر

عباد وسیم، درجہ: سوم اے، ایم سی ماڈل پرائمری اسکول، دہلی 6

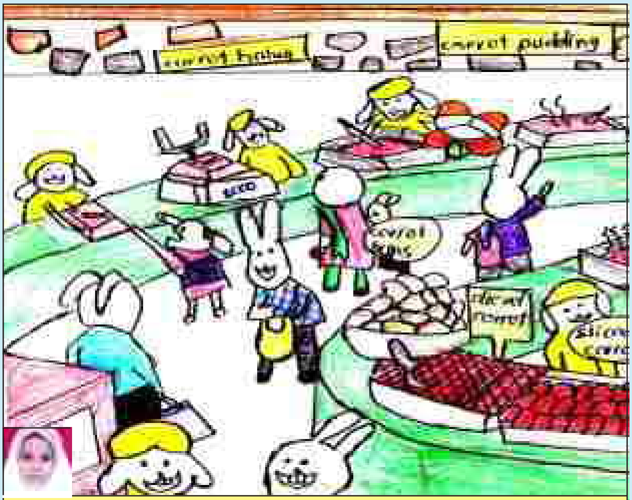

مومن طوبیٰ شفیق احمد، درجہ: ششم، مدرسہ عائشہ ہائی اسکول، مالیگاؤں، مہاراشٹر

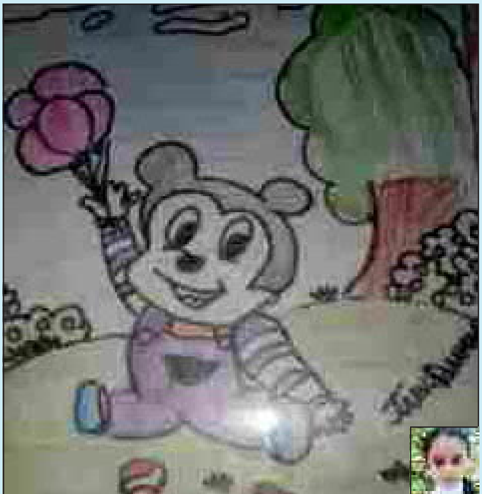

جویریہ، درجہ پنجم (اے)، ریان انٹرنیشنل اسکول، شاہجہانپور، یوپی

مریم، درجہ: یو کے جی (ٹیولپ)، ڈیون پبلک اسکول، ہاپوڑ، یوپی

عبداللہ، درجہ: سوم (اے)، ڈیون پبلک اسکول، ہاپوڑ، یوپی

بی بی اسماء محمد صدیق، درجہ: ہشتم (سی)، اینگلو اردو ہائی اسکول، دھولیہ (مہاراشٹر)

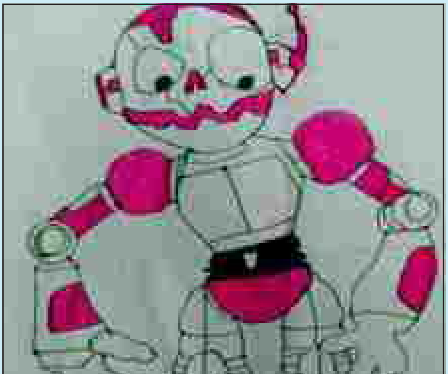

محمد میران خان سلیم خان، درجہ: نہم
بہادر شاہ ظفر اردو ہائی اسکول، بھساول، جلگاؤں، مہاراشٹر

حبیبہ کوثر محمد عمران، درجہ: ہشتم (سی)
اینگلو اردو ہائی اسکول، دھولیہ (مہاراشٹر)

عائد بلال، درجہ: چہارم، محمدیہ ماڈل اسکول، کھاری بانیہال، جموں وکشمیر

اردو فیس بک facebook

اگست 2018 کا 'بچوں کی دنیا' ہاتھوں میں آیا۔ آپس کی باتیں بہت پسند آئیں۔ رسالے میں شائع ہونے والے تمام مضامین کافی دلچسپ اور قابل تعریف ہوتے ہیں۔ پڑھ کر دل خوش ہوتا ہے۔ اس میں بڑوں کی باتیں، نظمیں، کہانیاں، کہکشاں وغیرہ بہت اچھے ہیں۔

معراج الدین، سیلر، پہلگام، کشمیر

میں سابیہ درجہ چھ کی طالبہ ہوں۔ اردو سے میری گہری دلچسپی ہے۔ گھر پر میری والدہ نے اردو کی ابتدائی تعلیم دی ہے۔ مجھے رسالہ 'بچوں کی دنیا' بہت پسند ہے۔ مجھے ہر ماہ اس کے آنے کا انتظار رہتا ہے۔ میں سمجھتی ہوں ہندوستان میں بچوں کے لیے اس سے بہتر رسالہ کوئی اور نہیں۔

سابیہ، گورنمنٹ گرلز سینئر سیکنڈری اسکول، جسولہ، نئی دہلی

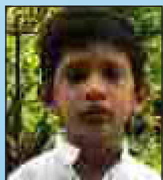

میرا نام معراج ایان مصطفیٰ ہے۔ میں درجہ دوم کیمبرج پرائمری اسکول کا طالب علم ہوں۔ میری پڑھائی انگریزی میڈیم سے ہے لیکن اردو پڑھنے اور سیکھنے کا بہت شوق ہے۔ گھر پر ممی مجھے اردو پڑھاتی ہیں۔ میرے پاپا 'بچوں کی دنیا' ہمیشہ خرید کر لاتے ہیں۔

معراج ایان مصطفیٰ، کیمبرج پرائمری اسکول، نیو فرینڈس کالونی، نئی دہلی

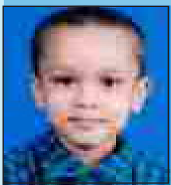

میرا نام عرفان ہے۔ میں زہرہ پبلک اسکول شاہین باغ میں پڑھتا ہوں۔ گھر پر سبھی لوگ اردو پڑھنا لکھنا جانتے ہیں۔ میری امّی 'بچوں کی دنیا' پڑھتی رہتی ہے۔ میں ابھی اردو صحیح سے پڑھ تو نہیں پاتا لیکن کارٹون اور پینٹنگ دیکھتا رہتا ہوں۔

عرفان، درجہ اوّل، زہرہ پبلک اسکول، شاہین باغ، نئی دہلی 25

پیارے دوستو! میرا نام شیخ عامر ارشاد ہے، 'بچوں کی دنیا' میں پہلی بار حاضر ہوا ہوں، میرے گھر والوں کو ہر ماہ 'بچوں کی دنیا' کا انتظار رہتا ہے۔ مجھے 'بچوں کی دنیا' میں کہانی اور ننھے فنکار کالم اچھے لگتے ہے۔

شیخ عامر ارشاد، بلریا گنج، اعظم گڑھ، یوپی

میرا نام احیان مطلوب ہے۔ میں درجہ دوم میں لٹرا ویلی اسکول پٹنہ میں پڑھتا ہوں۔ اردو ابھی اچھی طرح سے نہیں پڑھ پاتا ہوں۔ میری امی بچوں کی دنیا برابر پڑھتی ہے۔ مجھے کہانیاں اور نظمیں سناتی ہے۔ سن کر بہت مزہ آتا ہے۔ میگزین میں چھپی پینٹنگز مجھے اچھی لگتی ہیں۔

احیان مطلوب، درگاہ گھیرا سلطان، گنج پٹنہ 6 (بہار)

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

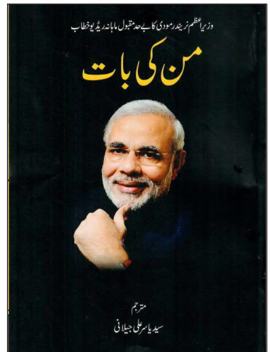

صفحات:550، قیمت: 205 روپے

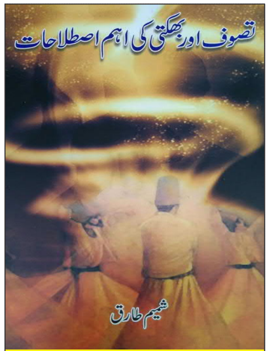

صفحات:411، قیمت: 185 روپے

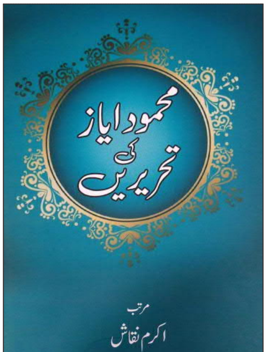

صفحات:619، قیمت:275 روپے

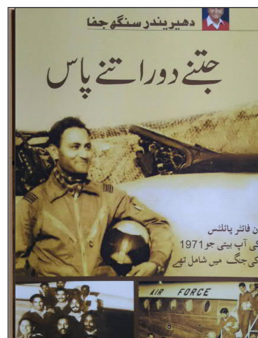

صفحات: 289، قیمت: 140 روپے

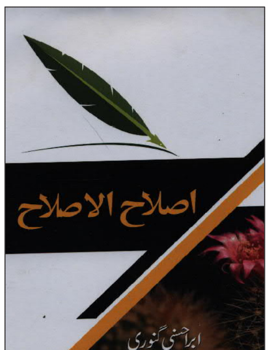

صفحات: 129، قیمت: 85 روپے

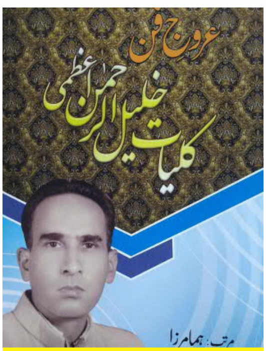

صفحات:260، قیمت:145 روپے

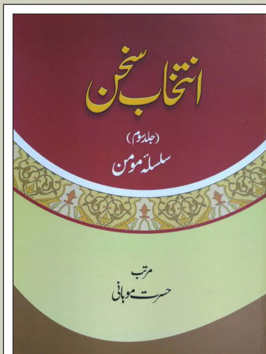

صفحات: 326، قیمت: 155 روپے

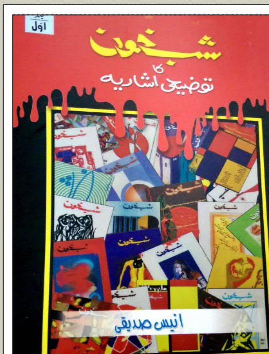

صفحات:1374، قیمت: 530 روپے

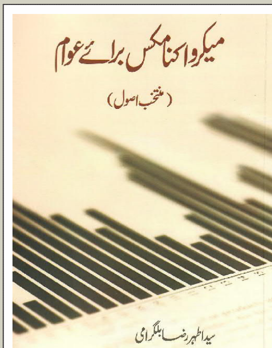

صفحات:196، قیمت: 110 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159 E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

BACHON KI DUNIYA Monthly, November 2018, Vol. 06, Issue: 11
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

RNI NO. DELURD/2013/50375
DL(S) - 01/3439-2016-18
ISSN 2350-1286
Date of Publication : 11/10/18
Date of Dispatch: 12 and 13 of advance Month

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

بچوں کے لیے قومی اردو کونسل کی چند دل چسپ کتابیں

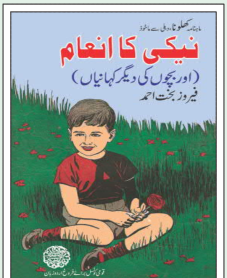

صفحات: 48 ، قیمت: 16 روپے

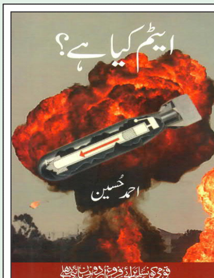

صفحات:149، قیمت: 24 روپے

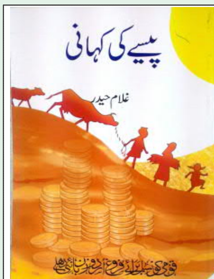

صفحات: 80 ، قیمت: 22 روپے

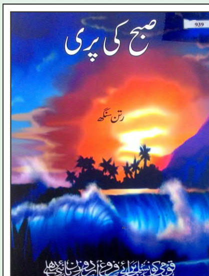

صفحات: 33 ، قیمت: 16 روپے

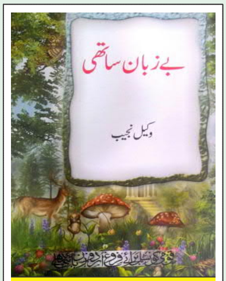

صفحات: 64، قیمت: 19 روپے

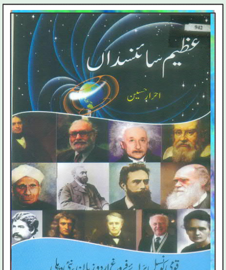

صفحت: 63، قیمت: 16 روپے

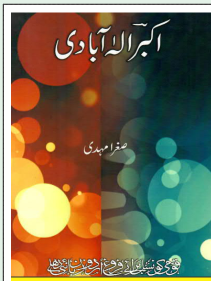

صفحات: 61، قیمت: 20 روپے

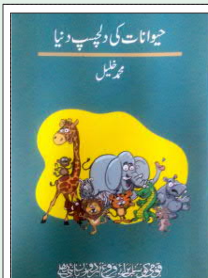

صفحات: 83، قیمت: 24 روپے

خریداری کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S. Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II, New Delhi - 110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan, FC-33/9, Institutional Area, Jasola, New Delhi -110025.